FICTION HOUSE

سامراج اور پاکستان

بیرونی امداد کے معاشی اور سماجی اثرات کا تجزیہ

فیروز احمد

سامراج اور پاکستان

(بیرونی امداد کے معاشی اور سماجی اثرات کا تجزیہ)

سامراج اور پاکستان

(بیرونی امداد کے معاشی اور سماجی اثرات کا تجزیہ)

فیروز احمد

فکشن ہاؤس

○ لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : سامراج اور پاکستان
(بیرونی امداد کے معاشی اور سماجی اثرات کا تجزیہ)

مصنف : فیروز احمد

اہتمام : ظہور احمد خاں

پبلشرز : فکشن ہاؤس، لاہور

کمپوزنگ : فکشن ہاؤس کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور

پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور

سرورق : ریاض ظہور

اشاعت اوّل : 1976ء (تیسری دنیا اشاعت گھر، کراچی)

اشاعت دوم : 2017ء

قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ، 68-مزنگ روڈ، لاہور۔فون: 042-36307550-51,37249218

فکشن ہاؤس: 53-52 رابعہ سکوائر، حیدر چوک، حیدر آباد۔فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور، دوکان نمبر 5، اردو بازار، کراچی۔فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

○ لاہور ○ کراچی ○ حیدر آباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

ڈاکٹر صغیر احمد کے نام

جنکی ناگہانی موت نے پاکستان کو

ایک سچے عوام دوست ماہر سماجی علوم سے محروم کر دیا

فہرست

☆ ایک عوام دوست مارکسی دانشور (ڈاکٹر فیروز احمد) ڈاکٹر ریاض احمد شیخ 9

☆ کتاب کی اہمیت اور افادیت ڈاکٹر ریاض احمد شیخ 14

☆ دیباچہ 17

☆ پہلا باب

انگریز سامراج اور پسماندگی کی بنیاد 29

☆ دوسرا باب

بیرونی امداد: جدید سامراج کا اہم ترین حربہ 45

☆ تیسرا باب

جدید سامراج کی ادارتی تعمیر نو 56

☆ چوتھا باب

معاشی ترقی یا مسلسل پسماندگی 68

☆ پانچواں باب
غیر ملکی سرمایہ کاری 86

☆ چھٹا باب
تجارت یا لوٹ مار 100

☆ ساتواں باب
نئی راہیں، نئی ٹھوکریں 118

☆ اصطلاحیں 135

☆ حوالہ جات 149

ایک عوام دوست مارکسی دانشور

ڈاکٹر فیروز احمد

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

ایک استاد اور محقق کی یہ سماجی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف اپنی تدریس کے ذریعے اپنے طلبہ میں سماجی تضادات، روشن خیالی، جمہوری سوچ اور طبقاتی تضادات کے متعلق آگہی فراہم کرے بلکہ وہ اپنی تحقیق کے ذریعے اپنے معاشرے کے ان تضادات کو بھی سامنے لائے۔ بدقسمتی سے پاکستان جیسے ملک میں جہاں بڑا عرصہ غیر جمہوری راج رہا اور ملک میں فکر کی آزادی پر قدغن لگی رہی اور مختلف حیلے بہانوں سے لوگوں سے حقائق پوشیدہ رکھنے کی روایت چلی آئی۔ اس ماحول کے باعث پاکستان میں تحقیق کے نئے زاویوں کو کچلا گیا اور عوام دوست اساتذہ اور محققین کو ان کے کام کرنے سے روکا گیا۔ لیکن حکمران اشرافیہ کے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود عوام دوست دانشوروں نے پاکستان کے مسائل اور تضادات کے متعلق عوام کو آگہی دینے کا عمل کو جاری رکھا۔ ان ہی ناموں میں ایک اہم نام ڈاکٹر فیروز احمد کا بھی ہے۔ وہ جتنا عرصہ اس ملک کے اندر رہ کر اپنے کام کو جاری رکھ سکے، انہوں نے یہ کام کیا اور جب حالات کی مجبوری کے باعث انہیں ملک چھوڑنا پڑا تو تب بھی باہر رہتے ہوئے بھی انہوں نے یہ کام جاری رکھا اور ایک پرعزم اور committed مارکسسٹ کے طور پر عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے رہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۰ء کو کراچی میں جنم لینے والے مارکسی ماہر عمرانیات اور سماجی مفکر ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنی ابتدائی تعلیم کراچی کے این جے وی اسکول، ایس ایم سائنس کالج اور کراچی یونیورسٹی

سے شاندار تعلیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے زولوجی اور مائیکروبایولوجی میں ۱۹۶۲ء میں بی ایس سی آنرز اور ۱۹۶۳ء میں ایم ایس سی کی ڈگریاں حاصل کی۔ وہ بی ایس سی اور ایم ایس سی میں دوئم آئے۔ تعلیمی میدان میں نمایاں کارکردگی دکھانے کے ساتھ ساتھ طلباء سیاست میں بھی سرگرم رہے اور کراچی یونیورسٹی کی طلبہ سیاست کا اہم حصہ رہے۔

بعد ازاں انہیں اپنی بہترین تعلیمی ریکارڈ کی بنیاد پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے دو وظائف مل گئے۔ انہوں نے فل برائٹ اسکالرشپ کے بجائے ایسٹ ویسٹ سینٹر، امریکا کے وظیفے کو فوقیت دیتے ہوئے ہوائی میں مرین زولوجی میں ایم فل کے لیے ۱۹۶۵ء کے اوائل میں داخلہ حاصل کرلیا۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنی اب تک کی تعلیم سائنس میں حاصل کی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے دادا اور والد دونوں بھی طبیب تھے۔ لیکن سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی ان کی دلچسپی سماجی علوم کی طرف بڑھتی چلی گئی اور مارکسی مطالعے نے ان کی اس دلچسپی کو مزید بڑھاوا دیا اور انہوں نے امریکہ میں اپنی آئندہ تعلیم کو سائنس کے بجائے سماجی علوم کی طرف موڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے انہیں کئی اضافی مضامین بھی لینا پڑے۔ ان اضافی مضامین کے ساتھ انہوں نے ہوائی یونیورسٹی کے عوامی صحت کے پروگرام کے تحت عمرانیات میں ۱۹۶۶ء میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ انہیں فوراً ہی اس برس دنیا کی بہترین یونیورسٹی یعنی جان ہاپکن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے لیے وظیفہ مل گیا۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنی انتھک محنت کے باعث اپنی پی ایچ ڈی کی تحقیق کا کام یونیورسٹی کے مقرر کردہ کم سے کم مدت یعنی تین برس سے چھ ماہ قبل ہی مکمل کرلیا۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ ایک انہونی بات تھی۔ بغیر وقت ضائع کیے ہی ڈاکٹر فیروز احمد نے دنیا کی بہترین جامعہ یعنی ہاورڈ یونیورسٹی سے پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی کام شروع کردیا اور ایک سال کے عرصے میں یہ کام بھی مکمل کردیا۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے امریکہ میں اپنی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ پاکستان کے سیاسی حالات سے اپنی دلچسپی برقرار رکھی اور خصوصاً امریکہ سے شائع ہونے والے رسالے Pakistan Student کے ذریعے ملک کے سیاسی حالات، ملک کی خارجہ پالیسی، پاکستان میں جمہوریت کی بحالی جیسے موضوعات پر تحریریں لکھ کر اس جریدے کی شکل بدل کر رکھ دی۔ اس سے قبل یہ جریدہ امریکہ میں پاکستانی سفارت خانے کی مالی مدد سے روایتی تحریروں کا مجموعہ

تھا۔ لیکن ڈاکٹر فیروز احمد نے تعریف و توصیف سے بھری تحریروں کے بجائے حقیقی مسائل اور موضوعات پر لکھا۔ وہ دو برس تک اس کے مدیر رہے۔ دو برس کی ادارت کے عرصے میں ان کے تعلقات پاکستان کے سفارتی عملے سے کشیدہ ہی رہے لیکن جریدے کی اشاعت کئی گنا بڑھ گئی اور یہ ایک مقبول جریدہ بن گیا۔

پوسٹ ڈاکٹریٹ مکمل کرتے ہی ڈاکٹر فیروز احمد کو امریکہ کی ایسٹ کیرولینا یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی ملازمت مل گئی۔ دو سالہ مدت ملازمت کے خاتمہ پر انہوں نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان واپسی کا منصوبہ ترتیب دے دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ۱۹۷۰ء کے آخر میں منعقد کیے جانے والے انتخابات کے بعد ملک میں جمہوری عمل کو آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور وہ پاکستان میں واپس جا کر اپنے کام کو جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن اسی دوران انتخابی عمل کے اختتام پر نہ صرف جمہوریت کی بحالی نہ ہو سکی بلکہ مشرقی پاکستان میں ایک فوجی کارروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے جنرل یحییٰ خان کی فوجی حکومت کے اقدام کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعے بنگالیوں کے حقوق کی حمایت شروع کی بلکہ اس مقصد کے لیے سیاسی اور احتجاجی تحریک کا بھی حصہ بنے اور اس فوجی آپریشن کے خلاف مظاہرے بھی منعقد کروائے۔ جس کے باعث اب ان کا پاکستان آنا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اس کے باوجود انہوں نے شمالی امریکہ میں ہی رہتے ہوئے ہی اس تحریک کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

اس دوران انہیں کینیڈا کی الگولا یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی آسامی پر تعیناتی مل گئی۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے اگلے چار برس تک یہاں ملازمت کی۔ یہاں ان کے دیگر رفقاء کے ساتھ ڈاکٹر حسن گردیزی بھی شامل تھے۔ اس عرصے کے دوران ڈاکٹر فیروز احمد نے تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کا کام بھی جاری رکھا اور کئی تحقیقی مضامین لکھے۔ لیکن ان کی پاکستان لوٹ کر واپس آنے اور یہاں تدریس، تحقیق اور سیاسی کام کرنے کی خواہش برقرار رہی اور اس کے باعث انہوں نے ۱۹۷۵ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو میں بحیثیت پروفیسر ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن اس وقت کے سندھ یونیورسٹی کے حالات سے مایوس ہو کر چند ماہ بعد ہی مستعفی ہو کر کراچی منتقل ہو گئے۔ انہوں نے یہاں منتقل ہو کر Institute for Third World Studies قائم کیا اور بعد ازاں اردو میں پاکستان فورم بھی شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ

ڈاکٹر فیروز احمد نے قبل ازیں اپنے امریکہ میں قیام کے دوران اسی نام (پاکستان فورم) کے نام سے انگریزی میں رسالہ شائع کرنا شروع کیا تھا لیکن امریکہ سے لوٹتے وقت انہوں نے اس رسالے کو وہاں سے شائع ہونے والے ایک اور جریدے میں ضم کرنے کا اعلان کر دیا تھا اور ان کے مضامین اب اس ضم شدہ جریدے میں شائع ہوتے تھے۔

ڈاکٹر فیروز احمد جہاں ایک طرف ملک میں جمہوریت کی مکمل بحالی کے لیے کوشاں تھے تو دوسری طرف بھٹو دور میں کی بلوچستان میں شروع ہونے والے فوجی آپریشن، مینگل کی حکومت کی برطرفی جیسے دیگر اقدامات کے سخت مخالف تھے لیکن جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء لگتے ہی وہ فوجی آمریت کے بڑے نقاد بن گئے اور ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے ایک بار پھر سرگرم ہو گئے۔ جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے لیے یہ بات کہاں قابل برداشت تھی۔ ڈاکٹر فیروز احمد اور ان کا جریدہ پاکستان فورم ایک بار پھر مشکلات میں گھر گئے۔ خفیہ اداروں کے اہلکار ہر وقت ان کی نگرانی پر معمور رہتے۔ ان کی حرکات وسکنات اور سرگرمیوں پر نظر رکھی جاتی۔ حالات ڈاکٹر فیروز احمد کے لیے ہر گزرتے دن کے ساتھ مشکل ترین ہوتے جا رہے تھے۔ ان مشکل حالات کے باعث انہیں ۱۹۷۹ء کے اواخر میں ملک سے جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ چند ماہ برطانیہ میں گزارنے کے بعد وہ ۱۹۸۰ء میں امریکہ پہنچے اور نیویارک کے بروکلے کالج میں جز وقتی پروفیسر کے طور پر پڑھانا شروع کیا۔ آئندہ چند برس تک دیگر کئی ملازمتیں کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے ۱۹۹۲ء میں واشنگٹن کی ہورڈ (Howard) میں مکمل پروفیسر کے طور پر تدریس کا عمل شروع کیا اور ۱۵ اپریل ۱۹۹۷ء کو اچانک دل کا دورہ پڑنے کے باعث ۷۴ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے پاکستان میں اپنے مختصر عرصے کے دروانیے کے قیام (۷۹۔۱۹۷۵ء) کے دوران پاکستان کی تمام ترقی پسند قوتوں، بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں کے باہمی اختلافات کم کرانے اور انہیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کی بھرپور کوششیں کیں۔ بغیر کسی سیاسی جماعت کا حصہ بنے انہوں نے ملک میں کسانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ملک بھر کے دورے کیے اور ملک کے زرعی نظام پر کئی شاندار تحقیقی مضامین بھی تحریر کیے۔

ڈاکٹر فیروز احمد کی تحقیق کا ایک اور میدان پاکستان کی قومیتوں کے حقوق کے حصول کیے

لیے جدوجہد بھی شامل تھا۔ انہوں نے اس موضوع پر کئی تحقیقی مضامین مارکسی نقطہ نظر سے لکھے۔ ڈاکٹر فیروز احمد نے استعماریت کے خلاف آواز بھی بلند کیے رکھی۔ امریکہ میں رہتے ہوئے سیاہ فام امریکیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر بھی وہ خاموش نہ رہے بلکہ وہ ان کے حقوق کی تحریک میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے رہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد نے اپنی مختصر زندگی میں کئی کتابیں، تحقیقی مضامین، اخباری مضامین لکھے۔ افسوس کہ یہ عظیم مارکسی سماجی مفکر اپنے ملک میں اس طرح جانا نہ جاسکا لیکن اس کے باوجود ان کے تحقیقی اور علمی کام کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر فیروز احمد کو اپنی اس بھرپور زندگی میں جہاں دیگر دوستوں اور ساتھیوں کا ساتھ شامل تھا وہاں ان کی سب سے بڑی مددگار اور حمایتی ان کی اپنی شریک حیات نادرہ احمد تھیں جو کہ خود بھی ان کی طرح ایک مستقل مزاج اور committed سیاسی کارکن ہیں۔ نادرہ احمد نے ڈاکٹر فیروز احمد کی وفات کے بعد کراچی یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ کی عمارت کے لیے ایک کروڑ کی رقم ۱۹۹۹ء میں فراہم کی اور اب یہ ڈاکٹر فیروز احمد انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے نام سے کام کر رہا ہے۔

کتاب کی اہمیت وافادیت

ڈاکٹر فیروز احمد نے یہ کتاب آج سے ۴۱ سال قبل ۱۹۷۶ء میں کراچی میں اپنے قائم کیے گئے Institute for Third World Studies کے زیرِ انتظام قائم کیے۔ تیسری دنیا، اشاعت گھر سے شائع کروائی۔ اب چار دہائیوں بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔ یقیناً کتاب ہر وقت کارآمد ہی رہتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آخر اس کتاب کی اتنے عرصے بعد دوبارہ اشاعت کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کتاب کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اوّل تو یہ کہ ڈاکٹر فیروز احمد نے اس کتاب کو بڑی تحقیق کے بعد لکھا اور اس کے مختلف ابواب قبل ازیں امریکہ اور دیگر مختلف ملکوں کے تحقیقی جرنلوں میں شائع ہوئے جس سے ان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ نوآبادیاتی دور میں تشکیل پاتے جنوبی ایشیا کے سماجی ڈھانچے اور خصوصاً وہ علاقے جو کہ بعد ازاں پاکستان بنے ان کے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو بڑے احسن طریقے سے اپنے پڑھنے والوں کے سامنے لاتی ہے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے وقت ان علاقوں کی اقتصادی پسماندگی، خصوصاً صنعتکاری کی عدم موجودگی کے باعث پاکستان کے سماج پر پڑنے والے اثرات پر بھی بڑے تفصیلی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ مزید یہ کہ پاکستان کی حکمران اشرافیہ (خصوصاً ملٹری اور سول بیوروکریسی) نے کس طرح قیام پاکستان کے بعد نئے اُبھرتے ہوئے سامراج یعنی امریکہ کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرنے پر زور دیا جس کے نتیجے میں پاکستان نے اپنے لیے مسائل پیدا کر لیے۔ پاکستان اس علاقے میں امریکی مفادات کا سب سے بڑا محافظ بن گیا۔ جس کے باعث جہاں ایک طرف اس نے خطے کے دیگر ممالک سے اپنے تعلقات بگاڑ لیے تو دوسری طرف امریکہ کی پشت پناہی کے باعث ملک میں

جمہوریت کے بجائے آمریت کو پنپنے کا موقع ملا۔ ملک کے بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات کے باعث جہاں ایک طرف سماجی شعبے کی ترقی بڑی بُری طرح نظر انداز ہوتی گئی وہیں ملک کے مشرقی حصے میں بیگانگی کا عمل بڑی تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا اور بالآخر ۱۹۷۱ میں مشرقی حصہ الگ ہو کر ایک جداگانہ ملک بن گیا۔ کتاب کی ایک اہم بات ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بھٹو دورِ حکومت میں پاکستان کی مشرقِ وسطیٰ کی طرف بڑھتی ہوئی دلچسپی تھی۔ یقیناً اس کی ایک بڑی وجہ تیل کی قیمتوں میں ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے باعث ہونے والا اضافہ تھا جس کے باعث وہاں تیزی سے ترقیاتی کاموں کا آغاز تھا اور پاکستان جیسا ملک اپنے اضافی انسانی وسائل کو مشرقِ وسطیٰ کی بادشاہتوں کو فراہم کرنے کا سب سے آسان ذریعہ بن گیا۔ پاکستان سے مہیا کی جانے والی یہ افرادی قوت بڑے ارزاں اجرتوں پر کام کرنے کو تیار تھی۔ وہ وہاں اپنے ساتھ رواں غیر انسانی رویوں اور برے حالات کی شکایت بھی نہیں کرتے نظر آتے۔ ان کی بھیجی ہوئی رقوم سے پاکستان کے مالی ذخائر میں اضافہ تو ہوتا رہا لیکن عام پاکستانی کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہ پڑا بلکہ اس رقم سے بھی ہم اسلحے کے ڈھیر ہی لگاتے رہے اور اس عرصے کے دوران ایٹمی پروگرام شروع کرنے کا اعلان ہوا اور ہماری حکمران اشرافیہ دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت ہونے کا تو بڑے فخر سے اعلان کرتی رہی لیکن سماجی پسماندگی پر بالکل شرمندہ ہونے کو تیار نہیں۔ یقیناً ڈاکٹر فیروز احمد نے یہ کتاب تو بہت پہلے لکھی لیکن یہ بات اب سمجھی جا سکتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں جا کر کام کرنے والے پاکستانی محنت کش وہاں رہتے ہوئے مذہبی انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کے زیرِ اثر آئے اور جس کے باعث ان کی بھیجی ہوئی رقوم سے جہاں ان کے اپنے گھر تو پختہ ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ مسجدوں اور مدرسوں کا ایک وسیع نیٹ ورک بھی بڑھتا ہی چلا گیا۔ ان محنت کشوں کو مشرقِ وسطیٰ میں قائم جبری نظام کے باعث نہ تو یونین سازی کا حق مل سکا اور نہ ہی انسانی حقوق کا کوئی تجربہ ہوا۔ دوسری طرف پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں جہاں ایک طرف طلباء اور محنت کشوں کی تنظیموں پر پابندیاں لگائی گئیں تو دوسری طرف افغان جہاد کا سہارا لیتے ہوئے مذہبی انتہا پسندی اور بنیاد پرستی کی بھرپور سرپرستی کی گئی۔ جس کے باعث آج ہم جس دوراہے پر کھڑے ہوئے اس کا ہم سب کو اندازہ ہے۔ ڈاکٹر فیروز احمد کی یہ کتاب یقیناً بعد کی آنے والی تبدیلیوں کو اس کے تاریخی تناظر میں اچھی طرح سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

کتاب کا اصل موضوع یعنی پاکستان کا سامراج کے ساتھ بخوشی شامل ہونا ماضی کا کوئی قصہ نہیں ہے بلکہ آج بھی پاکستان کی حکمران اشرافیہ پرانے سماج کو چھوڑ کر نئے سامراج کے ساتھ آنکھیں بند کر کے اس کا حاشیہ بردار بنے پر بغلیں بجاتی نظر آ رہی ہے۔ اس اشرافیہ نے نہ تو اس وقت عوامی مفاد کو سامنے رکھا تھا اور آج اس نئے اتحاد میں شامل ہوتے ہوئے اپنی ماضی کی غلطیوں سے سیکھنے کو تیار نہیں ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہم نے اس کو کبھی عوام کی بہتری کے لیے استعمال کرنے کا نہیں سوچا بلکہ حکمران اشرافیہ نے اپنی محدود سوچ کے باعث ان مواقعوں کو اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ کیا ماضی میں پاکستان امریکہ تعلقات کی روایت اب پاکستان چین کے تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات میں بھی اس طرح جاری رہے گی؟ ڈاکٹر فیروز احمد کی یہ کتاب ہمیں ایسے سوالات پر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ
ڈین کلیہ سماجی علوم
زیبسٹ، کراچی (SZABIST)
riazsheikh06@yahoo.com
0333-3119592

دیباچہ

آج سے تقریباً پچیس سال پہلے جب پاکستان میں امریکی امداد کا سلسلہ جاری ہوا تو اس کے ساتھ امریکہ کی فراخدلی اور پاکستان دوستی کا چرچا بھی بڑے زور و شور کے ساتھ شروع ہوا۔ یہ بات عام طور پر سُنی جاتی تھی کہ پاکستان کا گزارہ ہی امریکی امداد پر ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس آج پاکستان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو امریکی امداد کے متعلق خوش فہمی ہے۔ اس بدلے ہوئے رویے کی وجہ عالمی مطالعہ کم اور علمی تجربہ زیادہ ہے۔ علمی سطح پر حمزہ علوی اور امیر خسرو پاکستان کے پہلے دانشور تھے جنہوں نے امریکی امداد کے مُضر اثرات کا ٹھوس سائنسی تجزیہ پیش کیا۔ ان کے مقالے ''پاکستان۔ دی برڈن آف یو ایس ایڈ'' (۱) کو تیسری دنیا اور سامراجی ممالک کے انقلابی حقوق میں بے حد سراہا گیا اور اس کی وجہ سے جدید سامراج کے ہتھکنڈوں کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ لیکن یہ امریکی امداد پر ایک جامع مقالہ تھا جس کا مقصد اس وقت فقط بیرونی امداد کے استحصالی پہلوؤں کو بے نقاب کرنا تھا۔ بیرونی امداد کو مجموعی سامراجی حکمتِ عملی کے سانچے میں ڈال کر تجزیہ کرنا اور اُس کی کڑیاں پاکستان کی سماجی ساخت کے ساتھ ملانا اس مضمون کے دائرے سے باہر تھا۔ اسلیے یہ ضرورت اب بھی باقی رہی کہ پاکستان میں سامراجی غلبے کے تحت پیدا شدہ مفلوج معیشت کا جامع تجزیہ پیش کیا جائے اور ملک کی پسماندگی کو برقرار رکھنے میں سامراجی امداد کے رول کی واضح اور تفصیلی طور پر نشاندہی کی جائے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی نے جو منشور پیش کیا اس میں اس بات کا واضح طور پر اعتراف کیا گیا کہ پاکستان کی حیثیت بین الاقوامی سامراجی نظام میں محض سامراج کے دست نگر کی ہے اس منشور میں لکھا گیا تھا کہ:

''براہ راست نوآبادیاتی راج نے پاکستان کو جو سماجی اور اقتصادی نظام ورثہ میں دیا اس کو جاگیردارانہ، فوجی، افسر شاہی نظام کہا جا سکتا ہے۔ بعد کو ہونے والی تمام تر ترقی نے اسکو سامراجی، جدید نوآبادیاتی دائرہ اقتدار کے اندر دوسرے پسماندہ ملکوں کی طرح ایک محتاج سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیل کر دیا۔ ہم یہ صداقت سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان ایک سلطنت شاہی نوآبادیاتی طاقت کی محکومیت سے نجات پانے کی بجائے تمام سامراجی، جدید نوآبادیاتی طاقتوں کا حاشیہ بردار بن گیا۔

''دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر امریکہ کی راہنمائی کے تحت مغربی نوآبادیاتی طاقتوں نے نئے حالات کے مطابق اپنی لوٹ کھسوٹ کے طریقے بھی بدلنا شروع کر دیے۔ محکوم قوموں پر براہ راست راج ختم کر دیا گیا لیکن سابقہ مقبوضات اپنی اقتصادی، سیاسی اور فوجی مجبوریوں کی وجہ سے سابقہ حکمرانوں کے ساتھ جکڑی رہیں۔''(۲)

یہ احوال مجموعی طور پر درست اور واضح ہے۔ لیکن ایک تو یہ مکمل، ٹھوس اور جامع تجزیہ کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا اور دوسرے اس میں سامراجی امداد کے رول کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر پاکستان جدید سامراجی نظام میں ایک محتاج اور پسماندہ حاشیہ بردار کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ کون سے داخلی حالات ہیں جو اُسے ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں؟ سامراجیوں کی وہ کونسی پالیسیاں اور چالیں ہیں جو پاکستان کی محتاج حیثیت کو برقرار رکھنے میں سازگار ثابت ہوئی ہیں؟ سامراجی مفادات اور پاکستان کی سماجی ساخت کے مابین کون سا باہمی رشتہ ہے؟ پاکستان میں سامراجی تسلط یا غیر ملکی امداد کے اثرات کے متعلق سوچتے وقت یہ اور ایسے بیسیوں دیگر سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں۔

سامراج سے متعلق روسی انقلاب کے عظیم رہنما لینن کے پیش کیے ہوئے نظریے، اس نظریے میں جدید اضافوں اور دوسرے محکوم و نیم محکوم ملکوں پر چھپے ہوئے تجزیوں کی روشنی میں یہ نتیجہ برآمد کرنا کوئی مشکل نہیں کہ پاکستان کی پسماندگی (Underdevelopment) سماجی یا تاریخی

ارتقاء کی کوئی فطری یا لازمی منزل نہیں ہے۔ یہ ایک مخصوص سماجی صورت ہے جو نوآبادیاتی (Colonial) سامراجی تسلط کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اور جو جدید نوآبادیاتی (Neocolonial) غلبہ کی وجہ سے جاری ہے۔ سامراجی امداد سے متعلق تحقیق نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ بیرونی امداد جدید سامراجی تسلط کو جاری رکھنے کے اہم ترین ہتھیاروں میں سے ایک ہے۔ سماجی تجزیے کے مارکسی لینینی طریقے کی سائنسی صداقت اور دوسرے ملکوں سے متعلق تجربی (Empirical) حقائق کی موجودگی ہمیں اپنے ملک کے ٹھوس حقائق پر مبنی سائنسی تحقیق و تجزیہ کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتے۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۹۷۳ء میں میں نے پاکستان میں غیر ملکی امداد اور اس کے اثرات پر تحقیق کرنا شروع کی۔ یہ تحقیق ۱۹۷۴ء کے موسم گرما تک مکمل ہوگئی اور اس کے نتائج کو میں نے سلسلہ وار مضامین کی شکل میں امریکی کینیڈا اور فرانس کے رسالوں میں چھاپنا شروع کیا۔ اس مواد کو پاکستان کی زبانوں میں چھاپنے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ۱۹۷۴ء کی آخر میں میں نے ان تصانیف کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا۔ تحریر کو آسان بنانے اور تازہ ترین اعداد و شمار کو شامل کرنے کی غرض سے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی میں چھپے ہوئے مضامین کا ترجمہ کرنے کے بجائے اپنی تحقیق کے نتائج پر مبنی اردو میں نئے سرے سے ایک کتاب لکھی جائے۔ یہ کام دیگر مصروفیات کی وجہ سے جلد مکمل نہ ہو سکا اور کتاب کو پریس کے لیے تیار کرتے کرتے جولائی ۱۹۷۶ء آ گیا۔ اردو میں کتاب تیار کرتے وقت یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ کتاب کو جامع شکل دینے کے لیے (الف) اس کو محض سیاسی معاشیات تک محدود رکھا جائے اور سیاسی اور ثقافتی بالائی ڈھانچے (Superstructure) پر سامراجی اثرات سے متعلق مضامین کو خارج کر دیا جائے، (ب) پاکستان کی جدید سامراجی معیشت (Neocolonial economy) کی ساختی بنیاد کو بہتر طریقے سے سمجھنے کے لیے کتاب کا آغاز نوآبادیاتی معیشت (Colonial economy) پر ایک باب سے کیا جائے، (پ) پاکستان کے مسلم ممالک پر بڑھتے ہوئے معاشی انحصار کے رجحان کا تجزیہ کر کے آخر میں ایک اور باب کا اضافہ کیا جائے تا کہ اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے کہ آیا اس رجحان کی وجہ سے پاکستان کی معیشت آزادی کی طرف بڑھ رہی ہے یا نہیں۔

اس کتاب میں شامل مختلف ابواب کے لکھنے کا مقصد، ان کا مختصر مضمون اور اصلی اشاعت کی جائے و تاریخ حسب ذیل ہیں:

پہلا باب:

اس باب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ برطانوی راج نے کس طرح ہندوستان کے تاریخی ارتقا میں دخل اندازی کر کے اس کے سماجی ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر اپنے مفادات کے تابع کر دیا اور کس طرح ہمیں پسماندگی اور مفلوجی ورثہ میں دے دی۔ یہ باب زیادہ تر رجنی پام دت کی کتاب ''انڈیا ٹوڈے'' (۳) پر مبنی ہے اور اس میں میری اپنی تحقیق کا بہت کم دخل ہے۔ جب تک کہ کوئی اور حوالہ نہ دیا گیا ہو، اس باب میں شامل تمام اعداد و شمار اور اقتباسات اس کتاب سے لیے گئے ہیں۔

دوسرا باب:

اس باب میں جدید سامراجی طاقت امریکہ کے عروج کے اسباب اور قیام پاکستان کے وقت ملک کی معاشی اور طبقاتی صورت حال کا ذکر کرنے کے علاوہ جدید سامراج کے اہم ترین آلہ کار یعنی پاکستان میں بیرونی امداد کے بہاؤ کے متعلق اعداد و شمار اور دیگر حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب میں شامل مواد سب سے پہلے ''میرپ رپوٹز'' نامی رسالے کے مارچ ۱۹۷۴ء کے شمارے (۴) اور ''لوا کناسیت دو تیئر مونڈ'' نامی رسالے کے اپریل۔ مئی ۱۹۷۴ء کے شمارے (۴) میں شائع ہوا تھا۔

تیسرا باب:

چونکہ برطانوی نوآبادیاتی راج براہِ راست تھا اس لیے اس کا کام کم اور آسان اداروں کے ذریعہ چل سکتا تھا۔ اس کے برعکس جدید سامراجی طریقہ حکمرانی بالواسطہ اور پیچیدہ ہے، اس لیے جدید سامراجیوں کو بہت سے نئے ادارے قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکی امداد کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے کس طرح سامراجیوں نے پاکستان کی معیشت کو اپنے تابع کرنے کے لیے نئے ادارے قائم کیے۔ یہ مواد سب سے پہلے ''میرپ رپورٹز'' کے جون ۱۹۷۴ء کے شمارے (۶) میں شائع ہوا تھا۔

چوتھا باب:

اس باب میں پاکستان کی صنعتی اور زرعی ترقی پر غیر ملکی امداد کے اثر کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ سامراجی امداد ملک کی معیشت کو مفلوج بنا دیتی ہے، حکمران طبقوں کے ساتھ سامراجی مفادات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور نئے دلال پیدا کرتی ہے۔ اس باب میں شامل مواد ''میرپ رپورٹز'' کے نومبر ۱۹۷۴ء کے شمارے (۷) میں چھپے ہوئے ایک مضمون اور جولائی ۱۹۷۵ء میں ماڈاگاسکر میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں پیش کیے ہوئے مقالے (۸) پر مبنی ہے۔

پانچواں باب:

چونکہ غیر ملکوں میں سرمایہ کاری کر کے لوٹ کھسوٹ کرنا سامراجی استحصال کا ایک اہم جزو ہے اور چونکہ بیرونی امداد غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے میدان ہموار کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، اس لیے ہم نے پاکستان میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری اور اس کی نوعیت پر یہ باب اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ یہ مضمون پہلے ''تھرڈ ورلڈ فورم'' کے اگست ستمبر ۱۹۷۴ء کے شمارے میں (۹) میں چھپا تھا۔

چھٹا باب:

پسماندہ اور محکوم ملکوں کی صنعتی ترقی کو روک کر اُن کا خام مال پانی کے مول حاصل کرنا اور اپنی مصنوعات اور مشینری انکو مہنگے داموں پر فروخت کرنا جدید سامراجی لوٹ کھسوٹ کا سب سے اہم طریقہ ہے۔ پاکستان کی لوٹ مار بھی زیادہ تر تجارت کے ذریعہ ہوتی ہے اور اس غیر منصفانہ تجارت کو فروغ دینے کے لیے بیرونی امداد ایک موثر ہتھیار ہے۔ اس لیے اس باب میں اعداد و شمار کی روشنی میں پاکستان سے تجارت کے ذریعے کی جانے والی سامراجی لوٹ مار کے متعلق حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے ''میرپ رپورٹز'' کے نومبر ۱۹۷۵ء کے شمارے (۱۰) میں شائع ہوا تھا۔

ساتواں باب:

پچھلے دس سالوں میں تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں اور ایران کی طرف سے پاکستان کو کافی مالی امداد حاصل ہوئی ہے اور ان ملکوں کی طرف سے پاکستان میں سرمایہ بھی لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کی برآمدات کا ایک بڑا حصہ اب مسلم ممالک کو فروخت کیا جا رہا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ پاکستان کا اب سامراجیوں پر سے انحصار کم ہوتا جا رہا ہے اور ملک کی معیشت کی آزادانہ ترقی کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ مگر اس باب میں پیش کیے ہوئے ہمارے تجزیے سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جا سکتا۔ پاکستان کی معیشت کی محتاج حیثیت بدستور جاری ہے۔ یہ تجزیہ سب سے پہلے فروری ۱۹۷۶ء میں الجزائر میں منعقد ہونے والی تیسری دنیا کے ماہرین معاشیات کی کانفرنس میں ایک مقالے کی صورت میں پیش کیا گیا اور بعد میں اس کو ''ریس اینڈ کلاس'' نامی جریدے کے موسم گرما کے شمارے (۱۱) میں شائع کیا گیا۔

کتاب کو خشک اور عالمانہ (Academic) ہونے سے بچانے کے لیے اصلی مضامین میں درج اعداد و شمار کے بہت سے گوشواروں کو خارج کر دیا گیا ہے یا ضروری اعداد و شمار کو مضمون کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ تفصیلات میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اصلی اشاعت کے حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ یہ حوالے اور مختلف ابواب میں استعمال کیے ہوئے مواد کے حوالے اسی زبان میں درج کیے گئے ہیں۔ جس میں یہ مواد موجود ہے۔ ان حوالوں کا اردو میں ترجمہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جو مقالہ جس زبان میں چھپا ہوا ہے اسی زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ جو قاری حوالوں میں دلچسپی نہیں رکھتا وہ انہیں بخوشی نظر انداز کر سکتا ہے۔ ان قارئین کی سہولت کے لیے تمام حوالوں کو اکٹھا کر کے کتاب کے آخر میں چھاپا گیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنا مفید ہوگی کہ یہ کتاب بذات خود نہ تو پاکستان میں غیر ملکی امداد کے موضوع پر ایک مکمل جائزے کی حیثیت رکھتی ہے، اور نہ ہی اس کا مقصد پاکستان کی اقتصادی ترقی کا مکمل تجزیہ کرنا یا پاکستان کی سیاسی معاشیات پر ایک جامع تصنیف پیش کرنا ہے۔ ان موضوعات کو فقط اس حد تک چھیڑا گیا ہے جہاں تک یہ سامراجی تسلط

اور پسماندگی کے باہمی تعلق کو سمجھنے کی ضمن میں آتے ہیں۔

پاکستان میں اردو اور دیگر زبانوں میں سیاسی ادب چھپنے کی وجہ سے اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت سی سیاسی اصطلاحیں عام ہوگئی ہیں۔ ان اصطلاحوں میں کچھ کا استعمال غلط ہے اور کچھ کا مفہوم بہت محدود لیا جاتا ہے۔ ایک سنجیدہ تحقیقی تصنیف میں ان اصطلاحوں کو لاپرواہی سے استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں استعمال کی ہوئی چند اصطلاحوں کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب سے پہلے لفظ سامراج کو لے لیجئے۔ لفظ سامراج ہندی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں غیروں کے راج یا حکمرانی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جب انگریزی زبان میں لکھے ہوئے ادب کا اردو میں ترجمہ ہونے لگا تو یہ لفظ انگریزی لفظ امپیریلزم (Imperialism) کی جگہ استعمال ہونے لگا۔ ادھر انگریزی لفظ امپیریلزم خود صدیوں سے سلطنت شاہی اور شہنشاہیت کے لیے استعمال ہوتا آرہا تھا، اور ایسی سلطنتیں غلامانہ دور کے ملکوں، مثلاً روم نے بھی قائم کیں اور جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ ملکوں، مثلاً ایران نے بھی۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی شروعات میں یورپی سرمایہ دارانہ نظام میں ایک نئی اور واضح انتہا پر پہنچ کر اجارہ داری (Monopoly) کی منزل میں داخل ہوگا تھا اور بینکوں کا سرمایہ صنعتی سرمایہ کے ساتھ مل کر مالیاتی سرمایہ (Finance Capital) کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ سرمایہ داری کے اس نئے دور میں سرمایہ کی فراوانی کی وجہ سے برطانیہ، جرمنی اور فرانس فتوحات اور قبضہ کرنے کی باقاعدہ پالیسی پر گامزن ہوگئے تھے تاکہ ان نوآبادیات (Colonies) میں اپنا فالتو سرمایہ لگا کر مزید نفع کما سکیں۔ سرمایہ داری کے اس توسیع پسند رجحان کا روس کے عظیم انقلابی رہنما لینن نے سائنسی تجزیہ کر کے اس کو امپیریلزم کا نام دیا۔ جب سے مارکسی لیننی ادب میں لفظ امپیریلزم (اور اس کے اردو ترجمہ سامراج) کو ان مخصوص معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس تعریف کے اعتبار سے ہر جارحیت، ہر قبضہ اور ہر غیر ملکی تسلط لازمی طور پر سامراجی نہیں ہوتا۔ وہ سامراجی اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ ایک ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک کی طرف سے ہوتا ہو اور جس کی بدولت محکوم ملک پر عالمی تقسیم محنت مسلط کردی جاتی ہو اور اس کا سرمایہ کاری، تجارت اور دوسرے طریقوں سے استحصال کیا جاتا ہو۔ سامراجی تسلط کے لیے یہ بھی لازمی نہیں کہ براہِ راست حکومت کی جائے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے سامراجی تسلط براہ راست حکومت کے ذریعہ ہوتا تھا، جیسے ہندوستان میں برطانوی راج، اور اس

کو نوآبادیاتی (Colonial) نظام کہا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ براہ راست غیر ملکی راج کا نظام آہستہ آہستہ ختم ہوتا گیا لیکن رسمی طور پر آزاد ہونے والے ملکوں پر سامراجی تسلط اب بھی ختم نہیں ہوا اور وہ اب بھی ترقی یافتہ اور طاقتور سرمایہ دار ملکوں کی جدید نوآبادیات (Neocolonies) بنے رہے۔ نوآبادیات اور جدید نوآبادیات کے لفظی (Semantical) مسئلہ پر بعد میں بات کی جائے گی۔ فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ اگر لفظ سامراج کو مالیاتی سرمایہ کی توسیع پسندی اور اس کے ذریعہ کی جانے والی اقتصادی لوٹ کھسوٹ، سیاسی تسلط اور فوجی جارحیت ہی کے لیے مخصوص کر دیا جائے تو مالیاتی سرمایہ کی نشوونما سے پہلے یورپی ملکوں نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں جو تسلط قائم کیا تھا اسکو کیا کہا جائے؟ اگر اس کے لیے پہلے کوئی لفظ استعمال نہیں ہوا ہوتا تو ہم بے شک سامراج کے علاوہ ہی کسی لفظ کا انتخاب کرتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس تاریخی مظہر کے لیے تاریخ کی کتابوں میں پہلے سے ہی ایک لفظ موجود ہے اور وہ ہے سامراج یا امپیریلزم۔ اصطلاحات کے روایتی استعمال کو جاری رکھتے ہوئے اس کتاب کے پہلے باب میں برطانوی راج کے اوائلی ادوار کو بھی سامراج کہا گیا ہے لیکن مالیاتی سرمایہ کے غلبہ کی منزل اور اسکے کردار کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ باقی ابواب میں جہاں موجودہ سامراج کا تجزیہ کیا گیا ہے وہاں لفظ سامراج لینی معنوں میں ہی استعمال کیا گیا ہے۔

جہاں تک لفظ کلونیلزم (Colonialism) اور اس کے ترجمے نوآبادیت کا سوال ہے، تو یہ لفظ یورپی سامراجیوں نے نرم گوئی (Euphemism) کے طور پر استعمال کیا تھا۔ امریکی، کینیڈا، اسٹریلیا اور نیوزیلینڈ میں تو انہوں نے واقعی نئی آبادیاں قائم کیں لیکن برصغیر ہند میں دوسری جگہوں پر یہ محض دولت سمیٹنے کے لیے آئے تھے۔ بہرحال یہ لفظ براہ راست سامراجی حکمرانی کا ہم معنی ہو گیا، اور براہ راست سامراجی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی جب سامراجی رشتے نہیں ٹوٹے تو اس طریقۂ استحصال کو نیوکلونیلزم (Neocolonialism) یا جدید نوآبادیاتی نظام کا نام دیدیا گیا۔ روایتی استعمال کا احترام کرتے ہوئے میں نے بعض جگہوں پر اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا ہے ورنہ موجودہ سامراجی نظام کیلئے لفظ جدید سامراج کو ترجیح دیتا ہوں، اور اس لئے زیادہ تر میں نے اسی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔

پاکستانی سیاسی ادب میں لفظ جاگیرداری یا نیم جاگیرداری کا غیر تنقیدی اور غیر محدود استعمال

ہوتا رہا ہے۔ چونکہ تاریخی مادیت (Historical materialism) کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ سماجی ارتقاء میں سرمایہ داری (Capitalism) سے پہلے فیوڈلزم کی منزل آتی ہے تو اردو میں فیوڈلزم کا ترجمہ جاگیرداری کر کے اور برصغیر میں رائج زراعتی رشتوں کو جاگیرداری قرار دے کر ہندوستانی اور پاکستانی معاشرہ کی تاریخی درجہ بندی (Historical Categorization) کا مسئلہ حل کر دیا گیا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یورپ کے فیوڈلزم اور یہاں کے جاگیرداری نظام میں کافی فرق ہے۔ درحقیقت، ہمارے ملک میں زمینوں پر جو نظام قائم ہے یا تھا اُسکے فقط ایک چھوٹے حصہ کو جاگیردارانہ نظام کہا جاسکتا ہے۔ زمینداری نظام اس سے کئی گنا زیادہ عام رہا ہے۔ مالک اور مزارع کے رشتے کے علاوہ ہمارے ملک میں زمین پر مختلف قسم کے اور بھی پیداواری رشتے مروج رہے ہیں۔ لہذا میں نے اس کتاب میں ایک کے بجائے متعدد الفاظ، مثلاً جاگیردارای اور زمینداری استعمال کیے ہیں۔ لیکن کہیں بھی ان الفاظ سے میری مراد یورپ کی طرح کا فیوڈل نظام نہیں ہے۔ اصطلاح ''سرمایہ داری سے قبل کے رشتے'' (Pre Capitalist relations) اپنی جگہ بہت کارآمد ہے لیکن یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں جاگیرداری اور زمینداری نظام کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم کی عکاسی نہیں ہوتی۔ لہذا اس اصطلاح کو فقط پیداواری قوتوں اور رشتوں کے ارتقاء کے ضمن میں استعمال کیا جانا چاہیے۔

معاشیات کی تکنیکی اصطلاحات کو جہاں بھی ممکن ہوا ہے وہاں مضمون کے اندر ہی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن بعض جگہ جملے کے تسلسل کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ ان تمام اصطلاحات کی فرہنگ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کی گئی ہے۔

گولینن کے ''سامراج: سرمایہ داری کی آخری منزل'' نامی کتاب لکھنے کے بعد سامراج کا بنیادی کردار نہیں بدلا، پھر بھی اس کے استحصال کی شکلوں اور طریق کار میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ لینن کے طریقۂ تحقیق (Methodology) پر عمل کرتے ہوئے متعدد عالموں نے سامراج سے متعلق سوچ اور نظریہ کو کافی پختہ کر دیا ہے۔ ان عالموں میں سے جنہوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہیں پال بارن (Paul Baran)، پال سویزی (Paul Sweezy)، ہیری میگڈاف (Harry Magdoff)، آندرے گنڈر فرانک (Andre Gunder Frank)، پیئر ژالے (Pierre Jallee)، سمیر امین اور حمزہ علوی۔ میں سمجھتا ہوں کہ سامراجی تسلط اور پسماندگی

کا مقابلہ کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ہم سامراج سے متعلق جدید تجزیہ، تحقیق اور سوچ سے روشناس ہوں۔ میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس کتاب میں سامراج کا تجزیہ اسی جدید فکر کے پس منظر میں اور جدید سائنسی طریقۂ تحقیق کے ذریعہ کیا جائے۔ گو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس دیباچہ میں سامراج سے متعلق جدید نظریے (Theory) کا خلاصہ پیش کیا جائے، میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ سامراج کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے جو موٹی موٹی باتیں فرض کی ہیں ان کا ذکر یہاں کروں:

(۱) سامراجیت محض ایک سازش نہیں، اور نہ ہی یہ محکوم ملک کے سماجی ڈھانچے سے جدا ایک محض خارجی چیز ہے۔ جب ہم سامراجی نظام کی بات کرتے ہیں تو اس میں سامراجی ملک کا اپنا معاشی ڈھانچہ، محکوم ملک کی سماجی ساخت اور ان کے مابین رشتہ شامل ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں سامراجی تسلط مقامی حکمران طبقوں کے مفادات سے ہم آہنگی پیدا کر کے ہی قائم رہتا ہے۔

(۲) سامراجی تسلط سے کسی ملک کی فقط لوٹ کھسوٹ ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے نشوونما پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ سامراجی دنیا کی پسماندہ شکارگاہ بنا رہتا ہے اور اس کی پیداواری قوتیں آزاد نہیں ہو سکتی ہیں۔

(۳) سامراج ایک عالمگیری نظام ہے اور اسکا دفاع عالمی پیمانے پر ہوتا ہے۔ جس ملک میں ایک سامراجی ملک جنگ لڑ رہا ہو تو یہ لازمی نہیں ہے کہ اس ملک میں اس کا براہِ راست اقتصادی مفاد بھی ہو۔ سامراج کسی مخصوص ملک میں اقتصادی مفاد سے قطع نظر اپنے عالمی یا علاقائی مفادات کی غرض سے سیاسی اور فوجی دلچسپی بھی رکھ سکتا ہے۔ امریکہ نے ویت نام میں اپنی جارحانہ جنگ پر جو اربوں ڈالر کی مالیت خرچ کی ہے اس کا معاوضہ محض ویتنام کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔

(۴) ایشیا، افریقہ، اور لاطینی امریکہ کے پسماندہ ملکوں میں آج کل سامراج مالیاتی سرمایہ کی برآمد کی غرض سے کم اور اجناس کی برآمدگی

کی غرض سے زیادہ سرگرم ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں بھی براہ راست سرمایہ لگایا ہے وہ زیادہ تر خام مال کے ذرائع پر قبضہ کرنے کے لیے لگایا گیا ہے۔

(۵) برآمد ہونے والا سرمایہ سامراجی ملکوں کے سرمایہ داروں کے نجی سرمایہ کے تسط سے کم اور سامراجی ملکوں کے سرکاری خزانے میں سے زیادہ آتا ہے۔ لہٰذا بیرونی امداد سامراجی سرمایہ داروں کے مفاد میں بیک وقت محکوم ممالک کے عوام اور خود سامراجی ملک کے عوام کے استحصال کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیم محکوم ملکوں میں یہ سرمایہ ان کی صنعتی ترقی کو روکنے کے لیے، ان کا تجارت کے ذریعہ استحصال کرنے اور بیرونی نجی سرمایہ کاری کا میدان ہموار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۶) پاکستان میں سامراجی تسلط کا مطلب کم و بیش امریکی تسلط ہے، گو کہ پاکستان کو لوٹنے اور پسماندہ رکھنے میں جاپان، جرمنی، فرانس، انگلستان اور دوسرے سامراجی ملک بھی شریک ہیں۔ لیکن امریکی سامراج کے مقابلے میں انکی حیثیت ثانوی ہے۔

(۷) پاکستان کو جس غرض سے سامراجی اپنے دائرہ اثر میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہے پاکستان کی جغرافیائی اہمیت۔ لیکن بنیادی وجہ کچھ بھی ہو، ایک مرتبہ جب کوئی ملک سامراجی نرغے میں پھنس جاتا ہے تو اس کا اقتصادی استحصال ہونا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

(۸) گو کہ بیرونی امداد پاکستان پر سامراجی تسلط کا اہم ترین آلہ کار ہے لیکن یہ کسی بھی طرح اسکا واحد ہتھیار نہیں ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین کو پاکستان پر سامراجی غلبہ کی صحیح نوعیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور سامراج سے متعلق عام صحافیانہ مفروضوں اور سیاسی نعرے بازی کو تنقیدی طور پر جانچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔ ممکن ہے کہ سامراجی استحصال کے متعلق پیش کیے ہوئے بے شمار اعداد و شمار کی وجہ سے پڑھنے والے کے دل میں سامراج کے خلاف نفرت اور بھی

شدید ہو جائے۔ لیکن اس نفرت کا نسلی رنگ اختیار کرنا مصنف کے جذبے اور مقصد کے برخلاف ہوگا کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے اپنے سامراج دشمن شعور کی نشوونما میں خود سامراج ملکوں کے انقلابی اور سامراج دشمن دانشوروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اسی طرح اگر اس کتاب کی وجہ سے سامراج دشمن شعور میں ہونے والا اضافہ قاری کو یک طرفی سوچ اور ملک کے داخلی طبقاتی اور علاقائی استحصال اور ظلم کے حقائق سے فرار کی طرف لے جاتا ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ اس کتاب کو اس کے صحیح جذبے کے متعلق نہیں پڑھا گیا۔ سامراج آج کے دور کی سب سے بڑی عالمگیر حقیقت ہے اور دنیا کے تمام مظلوم عوام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ لیکن سامراج دشمنی کے نام پر اور مصنوعی قومی یا طبقاتی یکجہتی کے نام پر ملک کے اندرونی طبقاتی اور علاقائی ظلم کی پردہ پوشی کرنا عین سامراج کی منشاء کے مطابق سوچنے اور عمل کرنے کے مترادف ہے۔

۲۷ جولائی ۱۹۷۶ء

پہلا باب

انگریز سامراج اور پسماندگی کی بنیاد

''تمام خانہ جنگیاں، حملے، انقلابات، فتوحات اور قحط ہندوستان میں ہونے والے یہ متواتر عوامل چاہے کتنے بھی پیچیدہ، تیز رو اور تباہ کن معلوم ہوں، درحقیقت یہ سطح سے نیچے نہیں گئے۔ انگلستان نے ہندوستانی معاشرے کا پورا ڈھانچہ توڑ کر رکھ دیا ہے اور اس کے ازسرِ نو تعمیر ہونے کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ ایک نئی دنیا حاصل کیے بغیر اپنی پرانی کھو بیٹھنے سے ہندوستانی باشندوں پر ایک مخصوص قسم کی افسردگی طاری ہوگئی ہے اور برطانیہ کے زیرِ حکم ہندوستان اپنی تمام پرانی روایات اور اپنی پوری گذشتہ تاریخ سے علیحدہ ہوگیا ہے۔''

کارل مارکس، ''ہندوستان میں برطانوی راج'' ۱۸۵۳ء

انگریزوں نے ہندوستان میں سترہویں صدی کے اوائل میں قدم رکھا اور وہ ۱۹۴۷ء تک براہ راست اس برصغیر پر حاکم رہے، جب دو آزاد ملک بھارت اور پاکستان وجود میں آئے۔ ہندوستان اور پاکستان پر انگریز سامراجیوں کے اثر کو سمجھنے کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم فقط ان کی لوٹ کھسوٹ، زیادتیوں اور مظالم کی داستانیں پیش کر کے اپنے آپ کو تاریخ میں مظلوم ثابت کریں۔ تاریخی طور پر کسی بھی فتح، قبضہ اور حکمرانی کے اثرات کو سمجھنے کے لیے بنیادی طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے مقامی سماج کی پیداواری قوتوں کو کس طرح متاثر کیا، اس کے ارتقاء پر کس طرح اثر انداز ہوا اور کسی اس کی اقتصادی بنیاد (Base) پر قائم سیاسی اور ثقافتی

بالائی ساخت (Superstructure) میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں، مختصر الفاظ میں ہم کو جو سوال پوچھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ "انگریز سامراجی تسلط ہندوستان کی سماجی ساخت پر کس طرح اثر انداز ہوا؟" اس سوال کا جواب دینے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہندوستانی سماج میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کی چھان بین کے ساتھ ہندوستان میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں خود انگلستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیا جائے اور اس بات کا تعین کیا جائے کہ وہ کون سی تاریخی محرکات اور سماجی قوتیں تھیں جنہوں نے اولاً تو انگریزوں کو سامراجی فتوحات پر مجبور کیا اور پھر مختلف ادوار میں انکو مختلف پالیسیوں پر گامزن کیا۔

ہندوستان میں برطانوی راج کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱۲)

تجارتی سرمایہ کا دور (۱۸۰۰۔۱۶۰۰ء)

سولہویں صدی کے اواخر تک انگلستان میں فیوڈلزم (جس کا ترجمہ ہمارے ملک میں عام طور سے جاگیرداری کیا جاتا ہے) کے دقیانوسی نظام کا نام و نشان مٹ چکا تھا اور نوعمر تاجر طبقہ دولت اور سیاسی اقتدار کے لحاظ سے بالادستی حاصل کر چکا تھا۔ اب انگلستان میں مرتب ہونے والے اہم قوانین اور بیشتر سرکاری پالیسیاں اسی طبقہ کے تحفظ کے لیے عمل میں لائی جاتی تھیں۔ اس طبقہ نے صلیبی جنگوں میں حاصل کی ہوئی لوٹ اور مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ تجارت کے ذریعہ انگلستان کی منڈی میں ہندوستانی مال کو پہلے ہی سے روشناس کرالیا تھا۔ اب پرتگالی اور ڈچ تاجروں کی ہندوستان میں بڑھتی ہوئی تجارت کے پیشِ نظر انگریز تاجر کی ہوس اور بھی بڑھ گئی کہ وہ جلد ہندوستان پہنچ کر وہاں کی نفیس اجناس، خاص طور پر ریشمی اور سوتی کپڑے اور گرم مصالحہ کا کاروبار شروع کرے۔ اسی مقصد کے لیے ۱۶۰۰ء میں لنڈن میں ۷۰،۰۰۰ پاؤنڈ کے ابتدائی سرمایہ کی مدد سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔

سن ۱۶۰۸ء میں کیپٹن ہاکنس (Capt. Hawkins) تجارت کی غرض سے ہندوستان آیا اور سرت میں ایک تجارتی اڈے کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے سات سال بعد سر تامس رو (Sir Thomas Roe) نے جہانگیر بادشاہ سے مزید مراعات حاصل کیں جس سے انگریزی تجارت کو اور بھی فروغ ملا۔

انگریز نے جس ہندوستان میں تجارت کی غرض سے قدم رکھا تھا وہ کسی طرح بھی ان کے اپنے معاشرے سے زیادہ پسماندہ نہیں تھا۔ ہندوستان کا معاشرہ اس وقت خود کفیل دیہاتوں پر مشتمل تھا جن میں زمین، اور خاص طور پر اس کی پیداوار زیادہ تر مشترکہ ملکیت کے دائرے میں تھی۔ ہر علاقہ اور اکثر ہر گاؤں، اپنی ضرورت کی مصنوعات خود بناتا تھا۔ ہندوستان کے طول و عرض میں کھڈی کی صنعت وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ جہاز سازی، فولاد کی بھٹیاں، اور دیگر چھوٹی صنعتیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائی جاتی تھیں۔

یہ بات اہم ہے کہ اس زمانے کا ہندوستان اپنے خام مال کو استعمال کر کے اپنی ضرورت کی مصنوعات خود بناتا تھا۔ وہ نہ بیرونی مصنوعات کی درآمد کا محتاج تھا اور نہ ہی اسکو اپنا خام مال برآمد کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے عمدہ مصالحوں کے علاوہ تیار شدہ کپڑا اور دوسری مصنوعات تھیں۔ لیکن درآمد کرنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

ایسی صورت حال میں انگریز تاجر کو ہندوستانی مال کے عوض فقط سونا اور چاندی دینا پڑتا تھا جس سے تجارت کا توازن یک طرفہ ہو گیا تھا۔ وسطی امریکہ میں کی جانے والی غلاموں کی تجارت سے انگریز نے جو چاندی حاصل کی تھی وہ زیادہ تر ہندوستانی مال کو خریدنے میں صرف ہو جاتی تھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے انگریز تاجروں نے نت نئی ترکیبیں سوچیں۔ ایک تو انہوں نے اپنے مقامی ایجنٹ مقرر کیے جنہیں گماشتہ کہا جاتا تھا۔ یہ گماشتے دھوکہ، فریب اور تشدد کے ذریعہ دستکاروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی اشیاء کو بازار کے بھاؤں سے ۱۵ سے لے کر ۴۰ فیصدی کم قیمت پر انگریزوں کو فروخت کریں۔ انگریز اس خدمت کے عوض گماشتوں کو کمیشن دیتے تھے۔ دستکاروں کے استحصال میں دوسرا مقامی طبقہ جو انگریز تاجروں کا معاون تھا وہ تھا بنیا طبقہ جس سے مفلس دستکار سود پر قرضہ لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار ہندوستان میں بڑھتا گیا اور راجاؤں، نوابوں اور شہزادوں کے مابین اختلافات سے فائدہ لیتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی اور فوجی پوزیشن مستحکم ہوتی گئی، ویسے ویسے انگریز تجارت کا چوغہ پھینک کر برہنہ لوٹ مار پر اُتر آیا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے نتیجہ میں پورا مشرقی ہندوستان بمعہ بنگال، اوڑیسا، اور بہار انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس کے نتیجے میں انگریز نے جو مال بٹورہ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ

۶۳۔۱۷۶۰ء والے عرصہ میں ہندوستان سے ہونے والی پوری تجارت کے عوض انگریزوں کو ایک دھیلا بھی خرچ نہیں کرنا پڑا۔

۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اوڑیسا کی دیوانی مل گئی جس میں ٹیکس کی وصولی اور خزانہ کے انتظام کا حق بھی شامل تھا۔ اس طرح سے اب انگریزوں کو لوٹ کھسوٹ کرنے کے نت نئے ذریعے اور اختیارات ہاتھ آ گئے۔ اپنی کامیابی کی روداد بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں کمپنی کے سربراہ، بدنام زمانہ رابرٹ کلائیو (Robert Clive) نے اسی سال کمپنی کے ڈائریکٹروں کو لنڈن میں لکھا:

> ''میرے اندازے کے مطابق آئندہ آنے والے سال میں آپکی سابقہ مقبوضات بردوان کو شامل کرتے ہوئے، آپ کی آمدنی ڈھائی کروڑ سکہ روپیے سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوگی۔ اسکے بعد اس میں ۲۰ سے لے کر ۳۰ لاکھ تک کا اضافہ ہوجائے گا۔ جب تک امن بحال ہے آپ کے فوجی اور غیر فوجی انتظامی اخراجات ۶۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ نہیں بڑھ سکتے۔ نواب کا معاوضہ پہلے ہی گھٹا کر ۴۲ لاکھ کر دیا گیا ہے اور مغل بادشاہ کو دیا جانے والا نذرانہ ۲۶ لاکھ مقرر ہوا ہے۔ اس طرح سے کمپنی کو بقایا ایک کروڑ ۲۲ لاکھ سکہ روپیوں یعنی ۱۶ لاکھ ۵۰ ہزار نوسو پاؤنڈ کا یقینی فائدہ ہوگا۔'

دیوانی ملنے کے چھ سال بعد پارلیمان میں کمپنی کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں بتایا گیا تھا کہ اس عرصہ میں کمپنی کی آمدنی 1,30,66,761 پاؤنڈ اور اخراجات 90,27,609 پاؤنڈ ہوئے اور بقایا 40,37,152 پاؤنڈ برطانیہ ارسال کیے گئے۔ یاد رہے کہ اس رقم میں افسروں کی کی ہوئی لوٹ کھسوٹ شامل نہیں کی گئی تھی۔ انگریز سامراجیوں کے استحصال کا بہتر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۸۸۔۱۷۶۶ء کے عرصہ میں انگلستان میں ہندوستان سے 63,11,250 پاؤنڈ کا مال درآمد کیا گیا اور اس کے بدلے میں فقط 6,24,375 پاؤنڈ کا مال برآمد ہوا۔ درآمد ہونے والے سامان کی لاگت انگلستان سے بھجوانے کے بجائے ہندوستان میں لوٹ کے ذریعہ اکٹھا کیے ہوئے ''سرمایہ'' سے ادا کی جاتی تھی۔ تجارت کے بہانے ہونے والی اس لوٹ کو ۱۷۸۳ء میں برطانوی پارلیمان کی ایک منتخب کمیٹی نے اس طرح بیان کیا:

"بنگال اور انگلستان کے مابین ہونے والے لین دین، جس کو تجارت نہیں کہا جاسکتا، کا اگر حساب لگایا جائے تو محصولات سے کی جانے والی سرمایہ کاری کے مضر اثرات عیاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے جہاں تک کمپنی کا سوال ہے ملک سے درآمد کی جانے والی تمام پیداوار تجارتی تبادلہ کے ذریعہ نہیں بلکہ کوئی بھی رقم ادا کیے بغیر لے لی جاتی ہے۔"

اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں جبکہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا خود انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا۔ ۱۷۶۰ء میں اُڑنے والی نال (Flying Shuttle) منظر عام پر آئی۔ ۱۷۶۴ء میں ہارگریوز (Hargreaves) نے سوت کاتنے کی کل (Spinning Jenny) ایجاد کی۔ ۱۷۶۸ء میں واٹ (Watt) نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا۔ ۱۷۷۶ء میں کامپٹن (Compton) نے کاتنے کی ایک نئی مشین (Mule) تیار کی۔ ۱۷۸۵ء میں کارٹرائٹ (Cartwright) کو پاور لوم کا پیٹنٹ (Patent) ملا۔

ان ایجادات سے فائدہ لینے اور صنعتی انقلاب کو آگے بڑھانے میں جو سرمایہ لگایا گیا اس میں ہندوستان سے لوٹی ہوئی دولت کا بہت بڑا حصہ تھا۔ ڈگبی (Digby) کے اندازے کے مطابق پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) سے لے کر واٹرلو (Waterloo) کی جنگ (۱۸۱۵ء) تک انگریزوں نے ہندوستان سے ۵۰ کروڑ سے لیکر ایک ارب پاؤنڈ تک کا خزانہ سمیٹا جبکہ انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی تمام مشترکہ اسٹاک کمپنیوں میں لگے ہوئے کل سرمایہ کی مالیت فقط ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ پاؤنڈ تھی۔

انگلستان میں اب صنعتی سرمایہ داروں کا دور دورہ تھا۔ سماجی اقتدار اور نظریہ بھی اب اس بدلتے ہوئے پیداواری نظام کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے۔ حکومت کی کارکردگی اور بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات بھی ابھرتے ہوئے صنعتی سرمایہ دار طبقہ کے مفادات اور سوچ کے زیر اثر آرہے تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تجارتی سرمایہ داروں کے مفاد پر مبنی سامراجی "نوآبادیاتی" پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی بھی اسی زمانے میں ہونے لگی۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریز تاجروں کی حرکات پر جس گرمجوشی سے تنقید ہونے لگی تھی اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ آخر کار انگریزوں کو ہندوستان کے ساتھ کیے جانے والے ظلم کا احساس ہو گیا تھا اور وہ

اپنے گناہوں کی تلافی چاہتے تھے۔ تاجروں اور کمپنی پر کی جانے والی یلغار کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ہندوستان ''نوآبادی'' سے متعلق پالیسیوں کو اب انگلستان کے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا جائے۔

صنعتی سرمایہ کا دور (۱۹۰۰۔۱۸۰۰ء)

جبکہ تجارتی سرمایہ دار کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ دنیا کے کونے کونے سے سستے داموں مال خرید کر انگلستان کی منڈی میں بیچ کر منافع کمائے۔ صنعتی سرمایہ دار کے اغراض اس سے قطعی مختلف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ:

(الف) اپنی مقامی منڈی کو بیرونی درآمدات کے خلاف محفوظ کیا جائے۔

(ب) اپنی مصنوعات کے لیے بیرونی منڈیوں پر قبضہ کیا جائے۔

(پ) اپنی صنعتوں کے لیے بیرونی ممالک سے سستا خام مال حاصل کیا جائے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان میں برطانوی سامراجی پالیسی، براہ راست لوٹ کھسوٹ اور مالیہ کی وصولی کے ساتھ ساتھ، زیادہ تر ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال ہوتی رہی۔ ۱۸۱۳ء میں برطانیہ کی پارلیمان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی کارکردگی پر تحقیقات ہوئی جس کے نتیجے میں کمپنی کی اجارہ داری ختم کردی گئی۔ برطانوی سوتی مصنوعات کو تحفظ دینے کے لیے ہندوستانی چھینٹ پر 78 فیصد درآمدی ڈیوٹی لگادی گئی۔ برطانوی کپڑے کی صنعت کے لیے اس قسم کا تحفظ کتنا اہم تھا اس کا اندازہ ایچ ایچ ولسن (H.H. Wilson) کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''۱۸۱۳ء میں ثبوت کے طور پر کہا گیا کہ اُس وقت ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑہ منافع کماتے ہوئے بھی برطانوی منڈی میں برطانیہ میں تیار کردہ سوتی اور ریشمی کپڑہ سے ۵۰ سے ۶۰ فیصد کم قیمت پر فروخت کے لیے ہندوستانی اجناس پر ۷۰ یا ۸۰ فیصد ڈیوٹی لگائی جائے یا ان پر مکمل پابندی لگادی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا اور ایسی امتناعی ڈیوٹیاں اور ڈگریاں وجود میں نہیں آتیں تو پیزلی اور مانچسٹر کی ملیں اپنی ابتدا ہی میں بند ہوجاتیں اور شاید بھاپ کی قوت کے باوجود بھی دوبارہ حرکت

میں نہیں آ سکتیں۔ انہیں ہندوستان کی مصنوعات کو قربان کر کے وجود میں لایا گیا۔"

گوشوارہ نمبر ا

درآمدی ڈیوٹی کی شرح

جنس	برطانوی مصنوعات	ہندوستانی مصنوعات
سوتی کپڑہ	3.5فیصد	10فیصد
ریشمی کپڑہ	3.5فیصد	20فیصد
اونی کپڑہ	2فیصد	30فیصد

ایسی امتیازی شرح کا اثر تجارت پر ہونا لازمی تھا۔ لہذا برطانیہ سے ہندوستان میں درآمد ہونے والے سوتی کپڑے کی مقدار 1814ء میں 10 لاکھ گز (قیمت 26,000 پاؤنڈ) سے بڑھ کر 1835ء میں 5 کروڑ ایک لاکھ گز (قیمت 4 لاکھ پاؤنڈ) ہوگئی۔ اسی عرصہ میں ہندوستان سے برطانیہ برآمد ہونے والے سوتی کپڑے کی تعداد ساڑھے بارہ لاکھ ٹکڑوں (قیمت 13 لاکھ پاؤنڈ) سے گھٹ کر تین لاکھ چھ ہزار ٹکڑے (قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ) ہوگئی۔ 1844ء تک ان کی تعداد مزید گھٹ کر فقط 63 ہزار ٹکڑے رہ گئی۔

انگریز صنعت کاروں نے نہایت تیزی کے ساتھ ہندوستان کی منڈی میں اپنے قدم جمائے اور 1850ء تک برطانیہ کے سوتی کپڑے کی برآمد کا ایک چوتھائی ہندوستان کی منڈی میں بکنے لگا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں ہزاروں جلاہے بیروزگار ہو گئے۔ کپڑے کی تجارت تو درکنار اب انگریزوں نے مشین سے بُنا ہوا دھاگہ بڑی تعداد میں ہندوستان میں بیچنا شروع کیا۔ 1818ء سے لے کر 1836ء تک ہندوستان میں برطانوی دھاگے کی درآمد 5200 گناہ بڑھ گئی۔ اس کا سوت کاتنے والوں پر نہایت بھیانک اثر ہوا۔ بقول نہرو کروڑوں موت کا شکار ہو گئے۔ ان کی بدحالی اور افسردگی کی مثال، بقول لارڈ بینٹنک (Bentinck)، تجارت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

انگریزوں نے ہندوستان کی پھلتی پھولتی کپڑے کی صنعت کو تباہ و برباد کر کے ایک طرف تو مشین سے پیدا کی ہوئی اپنی مصنوعات کے لیے ایک وسیع منڈی بنائی تو دوسری طرف اپنی ملوں

کے لیے سستی خام کپاس حاصل کر لی۔ ہندوستانی کپاس کے لیے ان کی ہوس اس طرح بھی پوری نہ ہو سکی تو 1833ء میں انگریز باشندوں کو اجازت دی گئی کہ وہ زمینیں حاصل کر کے باغات قائم کریں۔ ہندوستانی کاشتکاروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ غذائی اشیاء کی جگہ نقد آور فصلیں لگائیں۔ اس کے علاوہ محصول وصول کرنے اور دیہی عوام کو کچلنے کے لیے انگریزوں نے خاص طور پر 1739ء کے مستقل آبادکاری ایکٹ (Permanent Settlement Act) کے ذریعہ، زمینداروں کا جو نیا طبقہ پیدا کیا تھا وہ بین الاقوامی تقسیم محنت میں ہندوستان کو برطانیہ کا زراعتی دم چھلہ بنانے میں نہایت کارآمد ثابت ہوا۔ انگریزوں کی ایسی پالیسیوں کے نتائج گوشوارہ نمبر ۲ میں درج اعداد و شمار سے ظاہر ہوتے ہیں:

گوشوارہ نمبر ۲

ہندوستان سے کپاس کی درآمد

سال	مقدار
1813ء	90 لاکھ پاؤنڈ
1833ء	3 کروڑ 20 لاکھ پاؤنڈ
1844ء	8 کروڑ 80 لاکھ پاؤنڈ
1914ء	96 کروڑ 30 لاکھ پاؤنڈ

اسی طرح پٹسن کی برآمد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی عوام کو فاقہ کشی پر مجبور کر کے اناج بھی برآمد کرنا شروع کر دیا۔ 1850ء سے 1875ء کے عرصہ میں جبکہ لگ بھگ 50 لاکھ ہندوستانی فاقہ سے مر گئے انگریز حاکموں نے ہر سال 10 لاکھ پاؤنڈ سے لے کر 80 لاکھ پاؤنڈ کی قیمت کا چاول وغلہ ہندوستان سے برآمد کیا۔

انگریزی صنعتی سرمایہ داری کے تقاضوں کے پیش نظر ہندوستانی صنعت کی تباہی اور ہندوستانی کاشتکار کی زبوں حالی کا نقشہ جواہر لال نہرو نے اس طرح سے کھینچا ہے:

> ''صنعتی بحران اب پھیلتا ہوا زمین کی طرف بڑھا اور زراعت کا مستقل بحران بن گیا۔ اراضی ملکیت دن بدن چھوٹی ہوتے ہوتے مضحکہ خیز حد

تک پہنچ گئی۔ زرعی قرضے کا بوجھ بڑھتا گیا اور زمین اکثر سود خوروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ بے زمین محنت کشوں کے تعداد کے حساب سے بڑھ گئی۔ ہندوستان ایک صنعتی سرمایہ دارانہ حکومت کے ماتحت تھا۔ لیکن اس کی اپنی معیشت سرمایہ داری سے قبل کے دور کی تھی جس میں اس دور کے دولت پیدا کرنے والے عناصر بھی موجود نہیں تھے۔ وہ جدید صنعتی سرمایہ داری کا خاموش آلہ کار بن کر رہ گیا۔ اور اس کے تمام امراض کا شکار تو ہوا لیکن اس کی کسی بھی خوبی سے مستفیض نہ ہو سکا۔'' (۱۳)

مالیاتی سرمایہ کا دور (1947ء۔1900ء)

انیسویں صدی کی آخری دہائی تک انگلستان میں بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کے مالیاتی سرمامیہ کو فوقیت حاصل ہو چکی تھی اور اجارہ داریاں قائم ہو چکی تھیں۔ اپنے وطن میں سرمایہ پر منافع کی شرح گھٹنے کے رجحان کو دیکھتے ہوئے برطانوی سرمایہ دار اب بیرونی ممالک میں سرمایہ لگا رہے تھے اور دوسرے سامراجی ممالک کے مقابلہ میں ''نو آبادیات'' کی چھینا جھپٹی میں پہلے سے بھی زیادہ کوشاں ہو گئے تھے۔ سرمایہ داری کی اس منزل کو روسی انقلاب کے بانی لینن نے امپیریلزم (Imperialism) کا نام دیا (جس کو ہندوستان اور پاکستان میں سامراج کہا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ دونوں الفاظ مالیاتی سرمایہ کے ابھرنے کے بہت پہلے سے بیرونی راج اور سلطنت شاہی کے لیے استعمال ہوتے آئے ہیں)۔

ہندوستان میں برطانوی مالیاتی سرمایہ کا غلبہ درحقیقت سرمایہ درآمد کیے بغیر ہی چھا گیا تھا۔ بیشتر سرمایہ خود ہندوستان سے ہی حاصل کیا گیا 1914ء تک ہندوستان میں برطانوی سرمایہ کی کل تعداد نصف ارب پاؤنڈ تھی۔ جس میں سے فقط 2 کروڑ 25 لاکھ پاؤنڈ 62-1856ء میں تجارتی ''خسارہ'' کی وجہ سے انگلستان سے لائے گئے تھے۔ لیکن یہ بھی لوٹ کھسوٹ سے پورے کر لیے گئے تھے۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی 1858ء میں برطانوی تاج کے حق میں سبکدوش ہوئی تو اُس نے افغان جنگوں اور سکھوں کے ساتھ جنگوں کی وجہ سے اکٹھا کیا ہوا 7 کروڑ پاؤنڈ کا ''قرضہ'' بھی

انگریز حکومت کے حوالے کیا۔ حکومت نے اس ''عوامی قرضہ'' کو برطانوی سرمایہ کاری کا حربہ بنا دیا اور اس کو بڑھاتے بڑھاتے 1939ء تک 12 ارب 79 کروڑ پاؤنڈ تک پہنچا دیا۔

جنگوں کے اخراجات کے علاوہ سب سے زیادہ برطانوی سرمایہ ریلوے میں لگایا گیا جہاں برطانوی سرمایہ داروں کو 5 فیصدی منافع لازمی طور پر ادا کیا جاتا تھا۔

یہ اکثر سنا گیا ہے کہ مالیاتی سرمایہ کے عروج کے بعد برطانوی سرمایہ کاروں نے ہندوستان کی صنعت کو خود ترقی دی اور مقامی سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کی جس کے نتیجے میں ہندوستان میں کافی حد تک جدید صنعتوں کا قیام عمل میں آ گیا۔ درحقیقت بات اتنی آسان نہیں ہے۔ برطانوی دورِ حکومت میں برطانوی مفادات کی بالادستی کے باوجود بھی جو صنعتی ترقی ہوئی اس کی کئی وجوہات ہیں:

(الف) ہندوستان میں کثیر مقدار میں منافع کمانے کی لالچ میں یقیناً کچھ مالیاتی سرمایہ داروں نے اپنا سرمایہ صنعتوں میں لگایا۔ لیکن نہ تو اس سرمایہ کی مالیت بہت زیادہ تھی اور نہ ہی یہ ہندوستان کی صنعتی ترقی کی اہم وجہ تھی۔

(ب) مشرق بعید میں برطانیہ کی پھیلتی ہوئی منڈی کو آسانی سے اور سستا مال فراہم کرنے کے لیے یہ بات نہایت موزوں تھی کہ ہندوستان کے سستے خام مال کو ہندوستان کی سستی محنت کے ذریعہ مصنوعات میں تبدیل کر کے قریب کی منڈیوں میں، بلکہ خود ہندوستان میں فروخت کیا جائے۔ ایسے مواقعوں کے پیش نظر انگریز سرمایہ داروں نے کپڑے کی کافی ملیں لگائیں۔ 1854ء سے لے کر 1915ء تک بمبئی میں جو کپڑے کی 96 ملیں لگیں ان میں سے 22 انگریزوں نے لگائیں۔ باقی ملیں مقامی سرمایہ داروں نے لگائیں۔ لیکن یہ تمام کے تمام سرمایہ دار خود برطانیہ کے گماشتے تاجر تھے جنہوں نے یہ ملیں ملکی منڈی کے لیے نہیں بلکہ مشرقِ بعید کی منڈیوں میں برطانوی سرمایہ داروں کے ساتھ حصہ داری کر کے کپڑے بیچنے کے لیے لگائی تھیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے کئی بیک وقت برطانیہ سے ہندوستان کی منڈی کے لیے تیار شدہ کپڑہ بھی درآمد کرتے تھے۔ (۱۴)

اسی طرح پٹسن کی ملیں قائم کرنے کی حکمت عملی کے پس منظر میں بھی برطانیہ کے مزدوروں کی اجرتوں کو بڑھنے سے روکنا اور قریب کی منڈیوں کو تیار مال فراہم کرنا تھا۔

(پ) ہندوستان میں برطانوی مالیاتی سرمایہ لگنے اور آمدورفت کے ذریعوں میں ترقی ہونے کی وجہ سے ورکشاپوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا ان نظم وضبط اور کاروبار کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے یہ ورکشاپیں قائم کی گئیں۔ چنانچہ یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک مدت تک ہندوستان کی صنعت سوتی کپڑے کی ملوں، پٹسن کے کارخانوں اور ورکشاپوں تک محدود رہی اور برطانوی صنعت کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہندوستانی صنعت پر جو پابندیاں لگائی گئیں تھیں وہ 1914ء تک بدستور قائم رہیں۔

(ت) پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان برطانوی سامراج کے حق میں اتنا موثر کردار ادا نہیں کر سکا جتنا برطانیہ کو امید تھی۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے اور ہندوستانی منڈی پر دوسرے سامراجی ملکوں کے مال کی یلغار کو روکنے کے لیے انگریز سامراجیوں نے مجبور ہو کر ہندوستان میں تھوڑی بہت صنعتی ترقی کی اجازت دی۔ لیکن صنعتی ترقی کی انگریز حاکموں نے مستقل مزاجی اور ثابت قدمی سے ہمت افزائی نہیں کی۔ جب کبھی بھی انگریزی مصنوعات کی ہندوستانی صنعت کے ساتھ ٹکر ہوئی حکومت نے کالے قوانین کے ذریعہ ہندوستانی صنعت کا گلہ گھوٹنے کی کوشش کی۔

مجموعی طور پر انگریزی صنعتی اور مالیاتی سرمایہ کا ہندوستان صنعت پر منفی اثر پڑا اور ہندوستان میں بڑھتی ہوئی پیداواری قوتوں کو آگے بڑھنے کے خاطر خواہ مواقع فراہم نہیں ہوئے۔ اس بات کا اندازہ ان اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے کہ صنعت پر دارومدار رکھنے والی آبادی کا تناسب 1911ء میں 11.2 فیصد تھا، 1921ء میں یہ گھٹ کر 10.49 فیصد ہو گیا اور 1931ء تک یہ فقط 10.38 فیصد رہ گیا۔ اس بیس سالہ عرصہ میں جبکہ آبادی میں 12.1 فیصد اضافہ ہوا، صنعت میں کام کرنے والے مردوں کی تعداد میں 12.6 فیصد کمی ہوئی۔ انگریزوں نے جس تیزی اور تناسب سے ہندوستان کی گھریلو صنعت کو تباہ کیا اس حساب سے مشینی صنعت کو ترقی نہیں دی۔

مالیاتی سرمایہ کے دور میں استحصالی اپنی دیگر تمام شکلوں میں بھی جاری رہا۔ درحقیقت اب تو لوٹ کھسوٹ کے پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ 1858ء سے قبل 75 سالوں میں نذرانے کے طور پر کل ڈیڑھ ارب پاؤنڈ برطانیہ بھیجے گئے تھے، لیکن راج کے آخری سالوں میں ہر سال سوا ارب سے لے کر ڈیڑھ ارب پاؤنڈ ارسال کیے جاتے تھے۔

ہندوستان پر برطانوی سامراج کے تسلط کے اثرات:

ہندوستان کے مختلف حصوں میں برطانوی راج ایک سو سال سے ساڑھے تین سو سال تک قائم رہا۔ اس دور میں ہندوستان کے باشندے جس طرح ظلم، مفلسی اور توہین کا شکار رہے اس کی داستانیں تاریخ کی کتابوں کے علاوہ ہمارے قصہ کہانیوں اور ادب میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی یادیں آج بھی بہت سے دلوں میں تازہ ہیں۔ مگر سامراج کے تیر کے نشان اگر صرف سطح تک محدود رہتے تو یہ زخم اب تک بھر چکے ہوتے اور ہم ایک روشن مستقبل کی طرف گامزن ہو چکے ہوتے۔ ہندوستان اور پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہ گھاؤ بہت گہرے ہیں اور زہران کے پورے جسم میں سرائیت کر چکا ہے۔ برطانیہ نے ہندوستان سے اس کی تاریخ چھین لی ہے اور اس کے سماج کی پیداواری قوتوں کو پابند کر کے سامراجی مفادات کے ماتحت کر دیا ہے۔ ایک خود کفیل، مصنوعات برآمد کرنے والے ملک کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی تقسیم محنت میں خام مال فراہم کرنے والا اور مصنوعات اور مشینری درآمد کرنے والا مفلوج ملک بنا دیا ہے۔

برطانوی سامراج نے اپنے مفادات کو پورا کرنے کے لیے خود ہمارے معاشرے میں اپنے ایسے خیر خواہ پیدا کر دیے جن کے اپنے مفادات سامراجی مفادات سے ہم آہنگ ہو گئے اور جن کو خود ملک کی پسماندگی سے فائدہ پہنچتا ہے۔ گماشتے، بنیے، تاجر، جاگیردار، اور گماشتہ سرمایہ دار کے علاوہ بیرونی مفادات کا تحفظ کرنے والی افسر شاہی اور فوج بنا گئے جو ملک کی حقیقی آزادی اور معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔

ہندوستانی معاشرے کی اندرونی ساخت کو اس طرح ردوبدل کر کے انگریز سامراج نے نہ فقط اپنے دورِ حکومت میں استحصال کی راہیں ہموار کیں بلکہ پسماندگی اور محتاجی ہم کو ورثہ کے طور پر دے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ رسمی آزادی ملنے کے بعد ان دونوں ملکوں کی پیداواری قوتیں آزاد نہیں ہو سکیں اور وہ بہت آسانی سے جدید سامراج (Neocolonialism) کے زیر سایہ ہو گئے۔

برطانوی سامراج اور پاکستانی علاقے:

تقسیم ہند کے وقت جو علاقے پاکستان کے حصہ میں آئے وہ تاریخی تجربات کی تفصیلات

کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک بنیادی بات میں یکساں تھے۔ یعنی ان سب میں جدید صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مشرقی بنگال (اب بنگلہ دیش) جو برطانوی راج کے تحت آنے والے سب سے پہلے علاقوں میں سے ایک تھا، تقسیم محنت میں ہندوستان اور برطانیہ کی ملوں کے لیے خام پٹسن پیدا کرنے والا پسماندہ علاقہ رہا۔

مغربی پاکستان میں بلوچستان کو تابع کرنے کا خاص مقصد اپنی سلطنت کی مغربی حدود کو فوجی طور پر مضبوط کرنا تھا۔ لہٰذا اس صوبہ کو باقی ملک کے ساتھ اقتصادی طور پر ضم (Integrate) نہیں کیا گیا بلکہ سینڈیمن (Sandeman) پالیسی پر عمل کرتے ہوئے چند جگہوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کر کے باقی حصوں کو مقامی سرداروں کے ذریعہ قابو کیا گیا۔

اسی طرح صوبہ سرحد میں برطانوی پالیسی زیادہ تر اسی فکر کے زیر اثر رہی کہ جنوب کی طرف زار شاہی روس کی بڑھتی ہوئی لہر کو کس طرح روکا جائے۔ حالانکہ جب یہ علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا تو انہوں نے اس کا استحصال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خاص طور پر یہاں کے مضبوط بدن محنت کشوں کو باقی ہندوستان میں سخت کاموں کے لیے سستے داموں استعمال کیا۔

پنجاب اور سندھ جہاں اب پاکستان کی 80 فیصد آبادی رہتی ہے، کو ہندوستان کا خام مال مہیا کرنے والا علاقہ (Hinterland) کر کے استعمال کیا گیا تا کہ باقی ہندوستان کی غذائی قلت کو پورا کریں اور بمبئی، احمد آباد اور انگلستان کے کپڑے کی ملوں کے واسطے کپاس پیدا کریں۔ اس علاقہ میں، خاص طور پر پنجاب میں اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے انگریزوں نے نہ صرف نہریں کھود کر نئے علاقے آباد کیے بلکہ ایک ظالمانہ جاگیرداری نظام بھی رائج کیا جس کے ذریعہ وہ دبا بھی سکتے تھے۔ مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی کی 1948ء کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب اور صوبہ سرحد کے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں میں سے کسی کا بھی حق ملکیت 1857ء سے پہلے کا نہیں ملتا۔ یعنی ان سب کو یہ زمینیں جنگ آزادی میں غداری کرنے کے عوض بطور انعام دی گئی تھیں (۱۵)۔

غرض یہ کہ پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کو نہ فقط پورے ہندوستان پر مسلط ہونے والی تقسیم محنت کی وجہ سے مفلسی اور پسماندگی نصیب ہوئی بلکہ سامراج کے تضادات کی وجہ سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جو تھوڑی بہت صنعتی ترقی ہوئی تھی اُس سے بھی وہ محروم

رہے۔ برائے نام جو صنعتیں اور کانیں پاکستان کے حصہ میں آئیں وہ قومی ملکیت کے ایک فیصدی حصہ کے برابر بھی نہیں تھیں۔ اور پھر یہ بھی انگریز اجارہ داروں کے ہاتھوں میں تھیں۔ اسی طرح بینکوں اور بیمہ کمپنیوں پر بھی برطانوی سرمایہ کا غلبہ تھا(۱۶)۔

تجارت کے لحاظ سے بھی پاکستان کی درآمدات کا سب سے بڑا حصہ برطانیہ سے آتا تھا اور پاکستان کی برآمدات کی کھپت ہندوستان کے بعد سب سے زیادہ برطانیہ میں ہی ہوتی تھی(۱۷)۔

اس لحاظ سے پاکستان کے تمام ذرائع پیداوار، مالیت، اور بیرونی تجارت انگریزوں یا ان کے مقامی گماشتوں کے ہاتھوں میں تھے اور ملک کے لیے جدید سامراج کا دُم چھلہ بنے رہنے کی تمام تر علتیں موجود تھیں۔ اگر تقسیم ہند کے وقت طبقات کے دولت اور اقتدار کے توازن میں ایک اہم تبدیلی نہیں آتی، جس کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے، تو یہ ملک بلاشبہ رسمی آزادی کے بعد بھی ایک عرصہ تک صنعتی ترقی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستانی باشندوں کو دبانے کے لیے اور عالمی جنگوں میں بارود کے طور پر استعمال کرنے کے لیے پنجاب کے لوگوں کا فوجی استعمال کیا اور یہاں پر جنگجویت، ملک دشمنی، ضمیر فروشی، جارحانہ ذہنیت اور شاونزم جیسی بیماریوں کی روایت ڈال دی۔ پنجاب کو فوجی بھرتی کا اڈہ بنا کر انگریزوں نے بارانی علاقوں کے چھوٹے مالک کسانوں کے کچھ مسائل تو عارضی طور پر حل کر دیے لیکن تاریخی طور پر ان کو ایک ناقابل معافی لعنت سے نواز کر گئے۔

انگریزوں کے عطا کیے ہوئے اس نظام کو پیپلز پارٹی کے منشور میں بجا طور پر ایک ''جاگیردارانہ، فوجی، نوکر شاہی'' سماجی اور اقتصادی نظام کہا گیا ہے(۱۸)۔

مسلمان سرمایہ دار برطانوی سامراجی دور میں:

چونکہ پاکستان دوقومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور اس کے حصول کی جدوجہد میں پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں کے لوگوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مسلمان بھی شریک تھے، اور چونکہ پناہ گزین سرمایہ داروں کا پاکستان کے اقتصادی ارتقاء میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں سامراج کا مزید تجربہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مسلمان سرمایہ دار کے کردار اور نشوونما پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

ہندوستان کے دیگر سرمایہ داروں کی طرح مسلمان سرمایہ داروں کے ارتقاء کی بھی یہ خصوصیت رہی ہے کہ گجرات کے تاجر سرمایہ دار اس میں پیش پیش رہے ہیں۔ انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب کثیر تعداد میں کپڑے کی ملیں لگنے لگیں تو اس زمانے کے دو صنعتی رہبروں میں خوجہ فرقہ کا ایک مسلمان سرمایہ دار قاسم بھائی دھرمسی بھی تھا(۱۹)۔ اسی طرح انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانی بڑے صنعتی سرمایہ داروں کے گھرانوں کی کھیپ تیار ہوگئی تھی اُن میں ابراہیم کریم بھائی کا خوجہ مسلمان خاندان بھی شامل تھا(۲۰)۔ لیکن مجموعی طور پر مسلمان تاجر صنعتکاری کرنے میں پارسی اور ہندو سرمایہ داروں کے پیچھے ہی رہے۔ 1854ء سے لے کر 1915ء تک بمبئی میں لگائی ہوئی کپڑے کی 96 ملوں میں سے فقط 10 ملیں مسلمانوں نے لگائی تھیں۔ اسی طرح 1915ء میں بمبئی کی 83 کپڑے کی ملوں میں سے فقط 11 اور 40 کمپنیوں میں سے فقط 7 مسلمانوں کے زیر انتظام تھیں۔(۲۱) مسلمان تاجر صنعت کے میدان میں نہ فقط دیر بعد داخل ہوئے بلکہ جب وہ ابھرنے لگے تو اسی زمانہ میں بمبئی کی کپڑی کی صنعت شدید بحران کا کار ہوگئی اور دو تہائی صنعت دیوالیہ ہوگئی(۲۲) اس کے بعد مسلمان سرمایہ دار پہلے کی طرح انگریزوں کی گماشتہ تجارت میں ہی سرگرم رہے۔

گجرات کے میمن، بُوہرہ، خوجہ اسماعیلی اور خوجہ اثنا عشری سرمایہ داروں کے علاوہ مسلمانوں میں جو تاجر گروہ نمایاں حیثیت کا حامل تھا وہ تھا چنیوٹی پنجابی، یہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہ کر بیرونی تجارت، خاص طور پر سوت کی برآمدات میں سرگرم تھا۔ بینکاری میں خوجہ اثنا عشری حبیب خاندان نے نمایاں ترقی کر لی تھی۔

پارسی اور ہندو سرمایہ داروں کے مقابلہ میں کمزور ہونے کی وجہ سے مسلمان سرمایہ داروں میں شدید سیاسی احساس پیدا ہوگیا تھا اور وہ شعوری طور پر تحریک پاکستان کی حمایت کرنے لگے تھے۔ نہ فقط قائداعظم نے حبیب، آرگ اور دوسرے سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کی تھی بلکہ ان سرمایہ داروں نے اپنے مفادات کو سمجھتے ہوئے مسلم لیگ کی مدد کی تھی۔(۲۳)

دوسری جنگِ عظیم میں سوت اور پٹسن کے کاروبار میں بعض مسلمان تاجروں نے بے انتہا دولت کمائی۔ یہ دولت سرمایہ کاری کے مواقعوں کی منتظر تھی۔ پاکستان کا قیام گویا ان کے لیے سونے پہ سہاگہ تھا۔

غرض یہ کہ قیام پاکستان کے وقت ایک طرف تو ہندوستان کی معیشت سے کٹا ہوا خام پٹسن اور کپاس پیدا کرنے والا صنعتی طور پر غیر ترقی یافتہ ملک تھا تو دوسری طرف دولت سے لدے ہوئے پنجابی اور کاٹھیاواڑی تاجر سرمایہ دار تھے۔ گویا دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش تھی۔ پاکستان کی معیشت پر انگریزوں کے غلبے کے باوجود اور مسلمان سرمایہ دار کے گماشتہ ہونے کے باوجود یہ قطعی ممکن تھا کہ پاکستان میں کپڑے اور پٹسن کی صنعت پروان چڑھے۔ کیونکہ اس وقت تک پاکستان کی کپاس کی برآمد اور تیار کپڑے کی منڈی میں انگریزوں کے مفادات بہت کم رہ گئے تھے اور جاپان ہی دونوں اعتبار سے نمایاں ملک تھا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کی خام پٹسن کا سب سے بڑا گاہک برطانیہ نہیں بلکہ بھارت تھا (۲۴)۔ لہٰذا پاکستان کے کپڑے اور پٹسن کی صنعت کی ترقی نہ تو پرانے برطانوی سامراج کے مفاد کے خلاف تھی اور نہ ہی دوسری جنگِ عظیم میں ابھرنے والے سامراجی کیمپ کے سربراہ امریکہ کو اس پر کوئی اعتراض ہوسکتا تھا۔ ایسی صورت حال میں مسلمان تاجر سرمایہ دار اگر پاکستان میں صنعت کاری نہیں کرتے تو وہ ایک تاریخی موقع اپنے ہاتھوں سے کھو دیتے اور انکے نقطۂ نظر سے پاکستان بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

دوسرا باب

بیرونی امداد: جدید سامراج کا اہم ترین حربہ

"عالمی بینک کے گروہ کا معمول کم و بیش یہی ہے کہ وہ آپ لوگوں اور دوسروں سے مل کر وہ عظیم تعمیراتی کام جاری رکھے جو آپ نے سلطنت کے ولولہ انگیز ایام میں شروع کیا تھا۔" عالمی بینک کے سابق صدر جارج وڈس، برطانوی بینکاروں سے خطاب، ۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء

دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے برطانوی سامراج کا عالمی اقتدار کمزور پڑ گیا تھا اور نوآبادیاں رفتہ رفتہ آزادی کی منزل کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ ان بدلتے ہوئے عالمی حالات میں ایک طرف تو سوشلسٹ ممالک کے بلاک کا قیام عمل میں آ چکا تھا، اور دوسری جانب امریکہ دنیا کی سب سے بڑی اور مضبوط سامراجی طاقت کی شکل میں اُبھر کر آ گیا تھا۔ نئے تقاضوں کے تحت سامراجی تسلط کے طریقے اور چالیں بھی بدل چکی تھیں۔ اب براہ راست سامراجی تسلط جمانے کی بجائے اقتصادی امداد اور فوجی معاہدوں کے ذریعے ایشیاء اور افریقہ کے ملکوں کو تابع کیا جانے لگا۔ اس قسم کے سامراجی تسلط کو جدید نوآبادیاتی نظام کہا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے زیرِ اثر رہنے کی وجہ سے ان ممالک کی سماجی ساخت کی کچھ اس طرح نشوونما ہوئی تھی کہ وہ جلد جدید سامراج کے شکنجوں میں پھنس گئے۔ سوائے چند ایک کے، مثلاً ویت نام، چین اور شمالی کوریا وغیرہ۔ جہاں آزادی کی تحریکوں کی قیادت محنت کشوں کی حقیقی پارٹیوں نے کی تھی، باقی سب نئے ممالک میں آزادی کے بعد اقتدار متوسط طبقے، زمینداروں، جاگیرداروں، افسر شاہی اور فوج کو نصیب ہوا۔ اپنے طبقاتی مفادات کے پیشِ نظر ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ سامراج سے ٹکر لیکر اپنے

ملکوں میں آزادانہ معاشی ترقی کروائیں گے۔ لہذا ہوا یہی کہ ان میں سے بیشتر ممالک کے حکمران طبقوں اور ٹولوں نے سامراج، اور خاص طور پر امریکی سامراج، سے گٹھ جوڑ کر لیا، اور اپنے ملک اور اسکے عوام کے استحصال میں سامراج کے معاون بن گئے۔

پاکستان اور امریکی سامراج:

یوں تو امریکہ کا برصغیر ہندو پاک کے ساتھ اُس وقت سے رابطہ رہا ہے جب سے انگریزوں نے ان دونوں علاقوں پر قبضہ کیا تھا۔ لیکن یہ تعلقات محض پادریوں، عالموں اور ملاحوں کے دوروں تک محدود رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں صدر روز ویلٹ (Roosevelt) کی انتظامیہ نے برصغیر میں باقاعدہ دلچسپی لینا شروع کی کیونکہ ہندوستان مغربی اتحادیوں کے دفاع میں نہایت اہم حیثیت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ کو اس بات میں بھی دلچسپی تھی کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد برصغیر کو اپنے دائرہ اثر میں لے لے۔

صدر ٹرومین (Truman) کے دورِ حکومت میں ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ تحریک پاکستان کی جانب کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ امریکی حکومت نے اس معاملے میں نہایت موقع پرستی سے کام لیا۔ بقول پروفیسر نارمن براؤن (Norman Brown):

> ''فروری ۱۹۴۷ء میں وزارت خارجہ نے اکھنڈ بھارت کے متوقع حل کا خیر مقدم کیا اور لیبر پارٹی کی حکومت کے اُس مہینے میں ہونے والے فیصلہ کو سراہا لیکن لیبر پارٹی کی حکومت نے جب اپنا فیصلہ الٹ کر تقسیم کا اعلان کیا تو وزارت خارجہ نے اسکی بھی تعریف کی۔'' (۲۵)

امریکہ کی عالمی سیاسی حکمت عملی میں پاکستان کے مقام کی اہمیت صدر آئزن ہاور (Eisenhower) کے دور میں واضح ہونے لگی۔ چین، روس اور تیل پیدا کرنے والے ممالک کے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے اب پاکستان کو خاص توجہ دی جانے لگی۔ امریکی حکمرانوں کی اس سوچ پر ایک پرانے برطانوی اعلیٰ افسر اولاف کیرو (Olaf Caroe) کا اثر نمایاں تھا۔ اس تجزیہ نگار نے بارہا امریکی حکمرانوں کو جتلایا کہ جنوبی اور جنوبی مغربی ایشیا، میں قدم جمانے کے لیے پاکستان کا جغرافیائی مقام انوکھا اور نہایت اہم ہے (۲۶)۔ اس سوچ کے زیرِ اثر اور سرد جنگ کے تقاضوں

کے پیش نظر امریکی وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس (John Foster Dulles) نے باقاعدہ طور پر پاکستان کو اپنا حاشیہ بردار بنانے کی کوششیں جاری کردیں۔ دوسری جانب ہندو مسلم فسادات اور جنگ کشمیر سے پیدا شدہ تباہی اور زبوں حالی سے پریشان پاکستانی حکمران جو نہ تو طبقاتی طور پر منظم تھے اور نہ اپنے مملکتی ڈھانچے کو باقاعدگی سے ترتیب دے سکتے تھے، اپنی بقا کے لیے بین الاقوامی اتحادیوں کی تلاش میں تھے تاکہ وہ پاکستان میں سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کی داغ بیل ڈال سکیں۔ انہوں نے ابتدا میں سامراج کے خلاف اور آزادی کی تحریکوں کے حق میں چند نعرے بلند کیے لیکن پھر فوراً تجارت اور امداد کی خاطر مغربی ممالک، خاص طور پر امریکہ کی طرف رجوع کیا۔ بعض عالموں مثلاً گنکاوسکی (Gankovsky) اور گورڈن پولونسکایا (Gordon-polonskoya) کا کہنا ہے کہ 1949ء میں حکومت پاکستان کے اس فیصلے کے پیچھے کہ وہ ہندوستان کی طرح اپنے روپیہ کی قیمت میں کمی نہ کرے، امریکہ کا ہاتھ تھا (۲۷)۔ اس فیصلہ کی وجہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارت میں شدید کمی ہوگئی اور پاکستان تجارت کی غرض سے سامراجی ممالک کے اور زیادہ قریب ہوگیا۔

بیرونی امداد کی مختصر کہانی:

مئی ۱۹۵۰ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان نے امریکہ کا دورہ کیا جہاں انہوں نے امریکی اعلیٰ افسروں، ایوان نمائندگان، تاجروں اور صحافیوں کو یقین دلایا کہ پاکستان سرمایہ دارانہ طرز معیشت سے منسلک رہے گا اور وہ ''آزاد دنیا'' کے دفاع میں یقین رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ آپ جارحیت کا مقابلہ کرنے کا عزم کر چکے ہیں.....
اس کام میں آپ پاکستان کو اپنا دوست پائیں گے۔'' (۲۸)

لیاقت علی خان کے دورے کے فوری نتیجے کے طور پر دسمبر ۱۹۵۰ء میں امریکہ کے ساتھ فوجی اسلحہ خریدنے کے لیے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ دو مہینہ بعد امریکہ نے پاکستان کے لیے پانچ لاکھ ڈالر کی تکنیکی امداد (Technical assistance) منظور کی۔ (۲۹) ۱۹۵۲ء میں کئی ایک امدادی معاہدوں پر دستخط ہوئے اور پاکستان کے لیے اب باقاعدہ طور پر امریکہ کی ایک

محتاج مملکت (Client State) بننے کی راہ استوار ہوگئی۔ امریکی امداد کا ملتے ہوئے ہاتھوں والا نشان اب پاکستان میں جگہ جگہ نظر آنے لگا، اور امریکی افسروں کا خیر مقدم اونٹوں کے گلے میں 'امریکہ تیرا شکریہ' (Thank You America) والی تختیاں پہنا کر ہونے لگا۔

چونکہ یہ پاک امریکہ عشق کا ابتدائی دور تھا جس میں پاکستان کو امریکی امداد کا ذائقہ چکھایا جا رہا تھا، اس لیے اس دور میں ملنے والی امداد کی شرائط کافی نرم رکھی گئیں۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان منظور ہونے والی امریکی اقتصادی امداد کا 83.24 فیصد عطیہ کے طور پر دیا گیا تھا (۳۰)۔ بقایا 16.76 فیصد قرضہ کی شکل میں دیا گیا تھا جس کا 57 فیصد پاکستانی روپیہ میں واجب الادا تھا۔ اس طرح 20.89 کروڑ ڈالروں کی منظور شدہ امداد میں سے فقط ڈیڑھ کروڑ کی رقم ڈالروں کی شکل میں واپس کرنی تھی۔ (۳۱)

امریکہ کی اس سخاوت کی وجوہات قطعی پوشیدہ نہیں تھیں۔ 19 مئی ۱۹۵۴ء کو پاکستان نے امریکہ کے ساتھ باہمی دفاعی معاہدے پر دستخط کر کے اسکے فوجی اتحادی ہونے کا رتبہ حاصل کر لیا۔ اسی سال ۸ ستمبر کو پاکستان نے جنوب مشرقی ایشیا معاہدے یا سیٹو (Seato) کی رکنیت اختیار لی۔ ایک سال بعد وہ امریکہ کے زیر نگرانی بغداد معاہدے (جسکو بعد میں سینٹو کا نام دیا گیا) میں شریک ہوگیا۔ اس طرح اسے امریکہ کا سب سے زیادہ منسلک اتحادی (Most Allied Ally) ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ اس وقت سے پاکستان کی جانب امریکی پالیسی کی بنیادی منطق یہی رہی ہے کہ پاکستان کی اقتصادی منصوبہ بندی، کو اپنے ہاتھوں میں لے کر، ملک کو اپنے دائرہ اثر میں ایک فرمانبردار دُم چھلے کی طرح رکھا جائے۔ بیرونی امداد کو اس غرض سے اولین آلہ کار کا درجہ دیا گیا۔

بہت جلد پاکستان کو اعلیٰ پیمانہ پر امریکی فوجی امداد حاصل ہونا شروع ہوگئی۔ اس امداد کے اغراض و مقاصد، اقتصادی امداد کے اغراض و مقاصد سے ہرگز مختلف نہ تھے۔ بقول عالمی بینک کے سابق صدر یوجین بلیک (Eugene Black):

> ''اقتصادی امداد اور مغربی ممالک کے دفاع کے درمیان براہ راست تعلق ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پسماندہ ممالک میں اپنی سیاسی اور اقتصادی پہل کاری کو قائم رکھنے کے لیے مغربی ممالک کو چاہیے کہ وہ اقتصادی

امداد کو اپنا اہم ترین ہتھیار بنائیں۔ یہ طریقہ مغرب کی اس خواہش سے
کہ کمیونزم کو پھیلنے سے روکا جائے، قطعی ہم آہنگ ہے اور آگے چل کر یہی
طریقہ سب سے زیادہ موثر ثابت ہوسکتا ہے۔ (۲۳)

پاکستان نے اقتصادی ترقی کے لیے اپنا پہلا پانچ سالہ منصوبہ اسی وقت پیش کیا جب وہ مکمل طور پر امریکہ کا اتحادی بن چکا تھا۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت پاکستان نے امریکہ سے مزید اقتصادی امداد کی درخواست کی جو اس نے خوشی سے قبول کی۔ لہٰذا پہلے منصوبہ کے لیے امریکہ نے 66.64 کروڑ ڈالروں کی امداد منظور کی جو پہلے منصوبے سے پیشتر کے دور کے مقابلہ میں تین گنے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن عطیہ کا تناسب اب 83.2 فیصد سے گھٹا کر 70.2 فیصد کر دیا گیا۔ مجموعی بیرونی اقتصادی امداد میں امریکہ کا حصہ اب 56.1 فیصد سے بڑھ کر 67.1 فیصد ہوگیا۔ لیکن اس رقم میں وہ امداد شامل نہیں جو امریکہ کے زیر اثر ادارے عالمی بینک نے پاکستان کے لیے منظور کی تھی۔ اس امداد کی رقم پہلے منصوبے سے پیشتر 5.8 کروڑ ڈالر اور پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے دوران 9.4 کروڑ ڈالر تھی (۳۳)۔

قبل اس کے کہ پاکستان کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ مکمل ہو، بری فوج کے کمانڈر جنرل ایوب خان نے جو تازہ تازہ امریکہ سے لوٹ کر آئے تھے، ملک فیروز خاں نون کی حکومت کا تختہ الٹ کر پاکستان میں فوجی آمریت قائم کردی۔ پانچ مہینوں کے اندر ہی اندر یعنی 5 مارچ 1959ء کو انہوں نے امریکہ کے ساتھ ایک نئے باہمی فوجی معاہدے پر دستخط کیے، اور ایک خفیہ سمجھوتہ کے تحت امریکہ کو پشاور میں ایک جاسوسی اڈے کی اجازت دے دی۔ یاد رہے کہ اس اڈے سے امریکی جاسوس فرانسز گیری پاورز (Francis Garry Powers) نے اُس یو۔ٹو (U-2) طیارے کی پرواز کی تھی جس کو روس نے راکٹ کے ذریعہ مار گرایا تھا اور جس کی وجہ سے شدید عالمی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔

اس حاشیہ برداری کے صلہ میں مغربی ممالک نے پاکستان کے لیے اقتصادی امداد کی رقم اور بھی بڑھادی، اور ایوب خان کو اس قابل بنادیا کہ وہ اپنے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے ٹارگیٹ کو پورا کرسکے۔ اس پانچ سالہ منصوبے کے دوران امریکی امداد میں 62 فیصد اضافہ ہوا۔ لیکن مجموعی امداد میں امریکہ کا تناسب گھٹ کر 45.6 فیصد ہوگیا۔ امریکہ کی منظور شدہ امداد میں

عطیہ کا تناسب گھٹ کر 21.3 فیصد رہ گیا۔ عالمی بینک کے قرضوں کا تناسب گھٹ کر 21.3 فیصد رہ گیا۔ عالمی بینک کے قرضوں کا جن کی رقم 45.37 ڈالر تھی، مجموعی امداد میں تناسب اب بڑھ کر 19.2 فیصد ہو گیا۔ (۳۴)

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی مدت کو واقعی پاک امریکہ اتحاد کا سہانہ دور کہا جاتا اگر اس کے آخری سالوں میں رنجش نہیں پیدا ہو جاتی۔ یہ رنجش اس وقت پیدا ہوئی جب امریکہ نے تمام معاہدوں اور پاکستان کی مکمل فرمانبرداری سے قطعہ نظر یہ فیصلہ کیا کہ وہ چین اور ہندوستان کے درمیان سرحدی تنازعہ میں مداخلت کر کے ہندوستان کو اسلحہ مہیا کرے گا۔ پاکستان کا خیال تھا کہ یہ اسلحہ چین کے خلاف نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف استعمال ہوگا۔ لہٰذا اس نے دبی زبان سے امریکہ سے احتجاج کیا۔ امریکہ نے اس کے جواب میں عوامی قانون نمبر 480 (PL-480) کے تحت پاکستان میں جمع شدہ روپیہ کو ہٹانے کی دھمکی دی اور صدر ایوب خان کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کیا۔ صدر ایوب نے پانسہ پلٹ کر بھارت کو چین کے خلاف مشترکہ دفاع کی دعوت دے دی۔

ابھی پاک۔ امریکہ دوستی معمول پر آئی بھی نہیں تھی کہ 1965ء میں بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔ امریکہ نے جس کی خواہش تھی کہ پاکستان اور بھارت آپس میں مل کر چین کا مقابلہ کریں، پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو دوبارہ اجاگر کرنے پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ مزید یہ کہ اپنی دفاعی مجبوریوں کے تحت پاکستان نے چین کی طرف جو دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا وہ بات امریکہ کو قطعی پسند نہیں آئی۔ ان وجوہات کی بناء پر پاکستان کو امداد دینے والی عالمی جماعت (Aid to Pakistan Consortium) یا کنسورشیم کے مذاکرات کو روک کر امداد معطل کر دی گئی۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے لیے بال آخر جب امداد دوبارہ شروع کی گئی تو اس میں شدید کمی کر دی گئی۔ امریکی امداد میں اب دوسرے منصوبے کے مقابلے میں ۲۰ فیصد کم رقم منظور کی گئی اور مجموعی امداد میں امریکہ کا حصہ مزید گھٹ کر 31.7 فیصد رہ گیا۔ امریکی امداد میں عطیہ کا تناسب اب محض 7.9 فیصد رہ گیا۔ عالمی بینک کی طرف سے دیے جانے والے قرضوں میں معمولی سا اضافہ ہوا۔ لیکن مجموعی منظور شدہ امداد میں اس کا تناسب بڑھ کر 18.5 فیصد ہو گیا (۳۵)۔ 1970ء میں چوتھے پانچ سالہ منصوبے کی بسم اللہ اور بھی بدشگونی سے ہوئی۔ سیاسی افراتفری اور سرمایہ داروں میں پھیلے ہوئے ہیجان کی وجہ سے پاکستان کی اقتصادی ترقی کی رفتار ماند پڑ گئی۔ متوقع عام انتخابات کے

پیشِ نظر ملک پر غیر یقینی کے بادل چھا گئے۔ پاکستان 73.8 کروڑ ڈالر بطور قرض اور 42.8 کروڑ ڈالر بطور سود ادا کرنے کے بعد بھی 1970ء کی وسط میں 3.15 ارب ڈالر کا مقروض تھا۔ اس سے ایک سال پہلے اس کو اپنے زرمبادلہ کا 19.5 فیصد قرضوں کی ادائیگی پر صرف کرنا پڑا تھا، اور 1970-71ء کے لیے اندازہ یہ تھا کہ اس کو 21.6 کروڑ ڈالر، یعنی متوقع زرمبادلہ کا 26 فیصد ادا کرنا ہوگا۔ اس قرضہ کو ادا کرنے اور نئے منصوبہ کے لیے سرمایہ کاری کرنے کے لیے اسے نئے قرضوں کی ایک بھاری رقم درکار تھی۔ لیکن 1970ء کے اواخر تک فقط 27.4 کروڑ ڈالر بطور نئی امداد وصول ہوئے تھے، اور فرض کیا جاتا تھا کہ 1.3 ارب ڈالر کی مزید امداد ابھی راستہ ہی میں تھی۔ (۳۶)

گوشوارہ نمبر ۳

پاکستان کو ملنے والی غیر ملکی امداد (کروڑ ڈالروں میں)

سال	کل امداد	امریکی امداد			عالمی بینک	کے قرضے
		رقم	کل کا فیصد	فیصد بصورت عطیہ	رقم	کل کا فیصد
1951-55	37.24	20.89	56.1	83.2	5.82	15.6
1955-60	99.30	66.64	67.1	70.2	9.40	9.5
1960-65	236.88	107.98	45.6	21.3	45.37	19.2
1965-70	270.02	85.69	31.7	9.7	50.10	18.6

Source : 25 Years of Pakistan in Statistics; 1947-1972, C.S.O. Karachi 1972.

1971ء پاکستان کی تاریخ میں ایک عظیم المیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال کے سیاسی ہنگاموں اور ان سے پیدا شدہ انسانیت سوز حالات کا علم ہم میں سے اکثر کو ہے۔ ان کے دھرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ معاشی طور پر ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کی صنعت اور تجارت برباد ہوگئی۔ پاکستان 1947ء کے دردانگیز حالات اور تباہ کن حالات کے بعد پہلی مرتبہ کسی زبوں

حالی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بگڑتے ہوئے معاشی حالات کے پیش نظر اپریل 1971ء میں حکومت نے ایک وفد واشنگٹن بھیجا تا کہ وہ امریکی حکومت اور عالمی بینک کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ قرض کی وصولی میں تاخیر کریں اور بین الاقوامی امدادی فنڈ (IMF) سے درخواست کرے کہ وہ پاکستان کو اس کے بگڑتے ہوئے توازن ادائیگی (Balance of Payments) کو سنبھالنے کے لیے ساڑھے سترہ کروڑ ڈالر کا قرضہ دے۔ امریکہ اور عالمی بینک کے اداروں نے ان حالات سے فائدہ لیتے ہوئے پاکستان سے تقاضا کیا کہ وہ ان 'اصلاحات' پر فوری عمل کرے جو انہوں نے کافی عرصہ سے پاکستان کو تجویز کیے تھے۔ ان 'اصلاحات' میں پاکستانی روپیہ کی قیمت میں کمی کرنے کی تجویز بھی شامل تھی (۳۷) لیکن اپریل کی آخری تاریخوں میں پیرس میں ہونے والی کنسورشیم کی میٹنگ میں پاکستان کی درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ جون کے مہینے میں پھر ایک میٹنگ ہوئی جس میں عالمی بینک نے پاکستان کے معاشی حالات پر ایک سنگین رپورٹ پیش کی اور جہاں یہ فیصلہ ہوا کہ پاکستان کے لیے کسی بھی نئی امداد کی تجویز پر فی الحال غور نہ کیا جائے (۳۸)۔ اگست میں امریکی حکومت نے اعلان کیا کہ پاکستان کو "انسانی ہمدردانہ" (Humanitarian) امداد کے سوا کوئی امداد نہیں دی جائیگی۔ جب تک کہ صدر امریکہ مطمئن نہ ہو جائیں کہ پاکستان میں استحکام بحال ہو گیا ہے۔ (۳۹)

لیکن یحییٰ خان کے راج میں کسی بھی استحکام کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ پاکستان ایک بحران سے نکل کر دوسرے بحران میں داخل ہو رہا تھا۔ امریکہ کی اس خواہش کے نتیجے میں کہ شیر کے ساتھ شکار کرے اور لومڑی کے ساتھ بھاگے۔ اس نے بظاہر تو پاکستان کے حق میں 'جھکاؤ' (Tilt) دکھایا، لیکن اس نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے روکنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ یحییٰ خان کی حکومت کو مصیبت زدہ اور پاکستان کے مستقبل کو غیر یقینی دیکھ کر اس کے مغربی اتحادیوں نے اور تو چھوڑیے قرض کی قسطوں کی ادائیگی میں بھی کوئی مہلت نہیں دی۔ لاچار ہو کر یحییٰ خان کو یہ یکطرفہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ چھ مہینے تک کسی بھی دوطرفہ قرضے کی ادائیگی نہیں کریں گے۔ لیکن عالمی بینک کے قرضوں کی قسطیں باقاعدگی سے ادا کی جاتی رہیں۔ حتیٰ کہ سقوط ڈھاکہ سے ایک روز قبل بھی ایک قسط ادا کی گئی۔ (۴۰)

لیکن اس قسم کی وفاداری کا مظاہرہ کسی کام نہ آیا۔ فوجی شکست کے ساتھ ہی ان کی حکومت

بھی اقتدار سے سبکدوش ہوگئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی نئی حکومت اور امداد دینے والے ملکوں اور اداروں کے درمیان ہونے والے مذاکرات میں اب قرضوں کی ادائیگی کے لیے مہلت دینے اور نئے قرضے حاصل کرنے کے علاوہ ایک نیا عنصر بھی داخل ہوگیا، وہ تھا غیر منقسم پاکستان کے مجموعی قرض کا پاکستان اور بنگلہ دیش کے بیچ میں بٹوارا۔ اور یہ آخری مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوسکتا تھا جب تک برصغیر میں کوئی سیاسی سمجھوتہ نہیں ہوتا۔

نئی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے تقریباً دو ہفتے بعد کنسورشیم کا ایک وفد، چیرمین کارگل (I.P.M. Carghill) کے زیر قیادت، پاکستان پہنچا (۴۱)۔ اسکے چند روز بعد امریکی حکومت نے پاکستان کے لیے اقتصادی امداد پر سے پابندی ہٹالی (۴۲) جنوری 1972ء کے اواخر تک عالمی بینک کے صدر رابرٹ میکنارا (Robert McNamara) پاکستان تشریف لائے تاکہ پاکستان کے ساتھ تعلقات کو 'معمول' پر لایا جاسکے اور پاکستان سے اس بات کی رضامندی حاصل کی جائے کہ وہ اپنی معیشت میں بدنام زمانہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کو 'کھوج' (Probe) لگانے کی اجازت دے دے۔ (۴۳) بین الاقوامی مالی فنڈ کے ساتھ مذاکرات بلاتاخیر شروع ہوگئے اور پاکستان نے اس کی وہ ڈھیروں شرائط منظور کرلیں جس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ اپنے روپئے کی قیمت میں کمی کردے۔ جب تک کنسورشیم کی اگلی میٹنگ 26 مئی 1972ء کو ہو، پاکستان میں روپئے کی قیمت میں 130% فیصد کمی کرنے، درآمدات پر سے پابندیاں ہٹانے اور برآمدات پر پابندیاں لگانے کا اعلان کردیا (۴۴)

کنسورشیم نے اس کے عیوض 23.4 کروڑ ڈالر کی حقیر رقم کے قرضوں کی ادائیگی میں مختصر وقفہ کی مہلت دے دی (۴۵)۔ اسکے بعد امداد دینے والے ممالک کے ساتھ علیحدہ علیحدہ بات چیت شروع ہوگئی، اور موسم خزاں تک نئی امداد کی ننھی ننھی بوندیں ٹپکنا شروع ہوگئیں، 1971ء کی وسط سے لے کر مارچ 1973ء تک پاکستان کو ملنے والی امداد کی رقم ساڑھے تینتالیس ((43.5 کروڑ ڈالر سے زیادہ نہ تھی۔ (۴۶)

1975ء کی وسط تک پاکستان کے اوپر بیرونی ملکوں کا پانچ ارب تیس کروڑ (5.3 ارب) ڈالر کا قرضہ تھا اور 75-1974ء میں قرضے کی واپسی کی سالانہ رقم 26 کروڑ 40 لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی تھی (۴۷)۔ اگر پاکستان ہر سال یہ قرضے باقاعدگی سے ادا کرتا تو اس کو اپنے برآمدات سے

کمائے ہوئے زرمبادلہ کا چوتھائی قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کرنا پڑتا۔ درآمدی اشیاء کی قیمتوں میں بھاری اضافے کی وجہ سے پاکستان میں یہ سکت نہیں تھی کہ وہ یہ قرضے باقاعدگی سے ادا کرے اور اپنے ترقیاتی منصوبوں پر بھی عمل کر سکے۔ اس لیے پاکستان نے پھر سامراجی ملکوں کی طرف رجوع کیا تاکہ وہ اسے قرضوں کی ادائیگی میں مزید مہلت دے دیں۔ اس سال کے مارچ میں امریکہ اور جاپان کے ساتھ ایسے سمجھوتے ہوئے ہیں جن کی بدولت پاکستان کو پرانے قرضوں کی ادائیگی میں مہلت دے دی گئی ہے (۴۸) لیکن ایسی مہلت سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یہ قرضہ اور نئے لیے جانے والے قرضے کسی نہ کسی وقت ادا کرنے ہونگے۔ ایک سرکاری تخمینے کے مطابق، قرضوں کی ادائیگی میں مہلت ملنے کے باوجود 76-1975ء میں پاکستان کو 29 کروڑ 50 لاکھ ڈالر ادا کرنے ہونگے (۴۹) لگاتار غیر ملکی امداد لینے کی وجہ سے پاکستان نہ صرف فقط 5 ارب ڈالر سے زائد رقم کا مقروض ہو چکا ہے بلکہ خود پاکستانی روپوں کی ایک کثیر رقم امریکہ کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ 1974ء کے اواخر تک یہ رقم 6 ارب 62 کروڑ روپے تک پہنچ چکی تھی (۵۰) یہ روپیہ جس طرح امریکہ کے ہاتھ آیا اس کو ہم اس طرح بیان کر سکتے ہیں: امریکہ سے گندم اور دیگر فاضل زرعی اشیاء درآمد کرنے کے لیے پاکستان کو اجازت دی گئی تھی کہ ان درآمدات کے ایک حصے کی ادائیگی وہ پاکستانی روپوں میں اسٹیٹ بینک کے اس خاص اکاؤنٹ میں جمع کروادے جو امریکیوں نے اپنے لیے کھول رکھا تھا۔ ان روپوں کو کاؤنٹر پارٹ فنڈز (Counterpart Funds) کہا جاتا ہے اور انہیں امریکی حکومت مختلف طریقوں سے استعمال کرتی ہے۔ امریکہ کے ہاتھوں میں پاکستانی روپے کی اتنی بڑی رقم ہونے سے جو صورتحال پیدا ہو سکتی ہے اسکی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت خود پاکستان میں زیر گردش زر کی رقم فقط ۱۲ (بارہ) ارب روپے کے قریب ہے۔ اگر امریکہ اپنے جمع شدہ روپے کو بازار میں چھوڑ دے تو پاکستان کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔

سرسری طور پر دیکھا جائے تو پاکستان میں بیرونی امداد کی کہانی ڈالروں کے عوض سیاسی وفاداری خریدنے کی کہانی ہے: پہلے "نرم" اور "پرکشش" عطیوں کے ذریعے، اور پھر رفتہ رفتہ سخت ہونے والے شرائطی قرضوں کے ذریعے۔ لیکن ظاہر ہے کہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ ہمارے حکمران کبھی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے سیاسی خودمختاری فروخت کر کے اس کی جگہ

اقتصادی ترقی خریدی ہے۔ لیسٹر پیئرسن (Lester Pearson) جیسے بیرونی امداد کے عذر خواہوں کے دعویٰ (۵۰) کے باوجود پاکستان آج بھی ایک نہایت پسماندہ ملک ہے جہاں اوسط فی کس آمدنی -/500 روپے سالانہ سے زیادہ نہیں، یہاں زندگی کا اوسط 50 سال سے زیادہ نہیں، جہاں ہر ایک سو شیر خواروں میں سے کم از کم 15 پہلی سالگرہ منانے سے پیشتر مر جاتے ہیں اور جہاں تعلیم کی شرح بمشکل 15 فیصد ہوگی۔ پاکستان کی مجموعی قومی پیداوار کا اب بھی بمشکل 15 فیصد مصنوعات پر مشتمل ہے اور تقریباً 50 فیصد فضول 'خدمات' پر مشتمل ہے۔

اسی اثناء میں خود کفیل ہونے کے وعدوں کے باوجود بیرونی امداد پر پاکستان کا انحصار اور بڑھ گیا ہے، بیرونی قرضوں کا بوجھ اور بھاری ہو گیا ہے، اور قرض کی ادائیگی کے اخراجات دن بہ دن زرمبادلہ کا ایک بڑھتا ہوا حصہ ہضم کر جاتے ہیں۔

پاکستانی عوام کی بڑھتی ہوئی زبوں حالی اور بیرونی امداد پر ملک کے بڑھتے ہوئے انحصار کے درمیان تعلق محض حادثاتی نہیں ہے۔ اس کتاب کے بقایا ابواب میں ہم اس بات کا تجزیہ پیش کریں گے کہ جدید سامراج نے بیرونی امداد کو اپنا آلہ کار بنا کر کس طرح پاکستان میں پسماندگی کو برقرار رکھا ہے۔

تیسرا باب

جدید سامراج کی ادارتی تعمیرِ نو

"تکنیکی امداد کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے سرکاری منصوبہ..... کے طور پر محض دینے کی خاطر، یا دوسروں کے بھلے کے لیے دیا جائے۔ امریکی حکومت کوئی خیراتی ادارہ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ امریکی عوام کے خیراتی جذبات کے اظہار کا مناسب ذریعہ ہے۔ تکنیکی امداد، امریکہ کے پاس اپنی خارجی پالیسی اور قومی مفاد کو فروغ دینے کے لیے متعدد اوزاروں میں سے ایک ہے۔"

امریکی سینٹ کی کمیٹی برائے خارجہ امور کی رپورٹ 1957ء۔

برطانیہ کے براہ راست سامراجی تسلط نے ہمارے ملک کے معاشی ارتقاء کو روک کر ہماری معیشت اور ہمارے سماج کو مفلوج بنا دیا تھا۔ رسمی آزادی کے ساتھ ہمیں ایک ایسا اقتصادی ڈھانچہ بھی ورثہ میں ملا جو مکمل طور پر سامراج کے بین الاقوامی معاشی نظام میں بری طرح جکڑا ہوا تھا، اور جس کا کردار بین الاقوامی تقسیم محنت میں سامراجی مفادات کے تقاضوں کو پورا کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہمیں ایسی طبقاتی تقسیم اور سیاسی توازن حاصل ہوا جن کی مدد سے سامراجی مفادات کو ہمارے ملک میں جوں کا توں رکھا جا سکتا تھا۔ ایک طرف زمیندار طبقہ اور گماشتہ سرمایہ دار طبقہ تھے۔ جن کے مفادات سامراجی مفادات سے ہم آہنگ ہو چکے تھے۔ اور دوسری طرف برطانوی سامراج کی پیدا کردہ وہ افسر شاہی تھی جس کا تمام تر تجربہ، رجحان اور نظریہ سامراج کی خدمت کرنا اور عوام کو دبانا تھا۔ اسی طرح انگریز سامراج نے فوج کو بھی اپنے مفادات کے تحفظ

کے لیے ترتیب دیا تھا۔ غرض کہ رسمی آزادی کے وقت ہمارے ملک میں وہ تمام عناصر موجود تھے جنکی وجہ سے ملک دوبارہ جدید نوآبادیاتی نظام کے پنجوں میں پھنس سکتا تھا۔

لیکن براہ راست کیا جانے والا نوآبادیاتی راج خود بخود بغیر کسی اداراتی ترمیم کے بادلواسطہ کیے جانے والے جدید نوآبادیاتی راج میں تبدیل نہیں ہوجاتا۔ رسمی آزادی ملنے کے بعد پالیسیاں لندن سے بن کر آنے کی بجائے بظاہر آزاد ملک کے دارالحکومت میں بنتی ہیں، اوران پر سفید فام اعلیٰ افسروں کے بجائے سیاہ، گندمی یا زرد رنگ کے چہروں والے مقامی وزیروں یا افسروں کے زیر نگرانی عمل میں کیا جاتا ہے۔ اب اگر اس منصوبہ بندی، پالیسیوں اور عمل کو جدید سامراج کی منشا کے مطابق چلانا ہے تو یہ بات لازمی ہوجاتی ہے کہ کچھ ایسے نئے ادارے وجود میں لائے جائیں، یا پرانے اداروں کی اس طرح سے ترمیم کی جائے کہ جدید سامراج کے تسلط کو مقامی حکمرانوں کے اپنے مفادات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے بالواسطہ جاری رکھا جاسکے۔ اس عمل کو ہارلن کلیولینڈ (Harlan Cleveland) نے نرم بیانی کرتے ہوئے 'ادارتی تعمیر' (Institution Building) کا نام دیا ہے۔ (۵۲)

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب امریکی سامراج نے سابقہ نوآبادیوں پر اپنا تسلط جمانے اوران کو لوٹنے کے لیے بیرونی امداد کے ایک وسیع پروگرام پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ادارتی تبدیلی کے مسائل کے پیشِ نظر اس پروگرام کا مرکز تکنیکی امداد کو بنایا گیا۔ تکنیکی امداد وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ خاطر خواہ ادارتی تبدیلی یا تعمیر نو کی جاسکتی ہے۔ اس لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ گذشتہ دہائی کے آخری سالوں میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی طرف سے دی جانے والی مجموعی امداد کا 23 فیصد تکنیکی امداد کی صورت میں تھا (۵۳)۔ تکنیکی امداد، جدید سامراج کے لیے ادارتی تعمیر کرنے کے علاوہ ان اداروں، ملک کے دوسرے سرکاری اور تعلیمی اداروں اور سرکاری و نجی شعبوں کے لیے، عملے کو تربیت دینے کے لیے اور دیگر کاموں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ لیکن یہاں ہماری بحث کا موضوع ادارتی ترمیم و تعمیر ہے۔ یاد رہے کہ ادارتی تعمیر کے لیے تکنیکی امداد کے علاوہ دوسرے قسم کی امداد بھی دی جاتی ہے۔

پاکستان کی اقتصادی منصوبہ بندی پر امریکی چھاپ:

اقتصادی منصوبہ بندی روایتی سرمایہ دارانہ نظریہ کی منافی ہے، لیکن سوشلسٹ ممالک کی ترقی

کے لیے منصوبہ بندی لازمی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور دیگر سابقہ نوآبادیوں میں، جہاں کوئی سوشلسٹ انقلاب برپا نہیں ہوا تھا، رسمی آزادی کے بعد اقتصادی منصوبہ بندی رائج کردی گئی۔ درحقیقت، بدلے ہوئے حالات میں اقتصادی منصوبہ بندی خود نئے سامراجی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک موثر آلہ کار ثابت ہوسکتی تھی۔ کیونکہ منصوبہ بندی کے اداروں اور عمل پر سامراجی قابض ہوکر ملک کے معاشی اور سماجی فوقیات کی ترتیب کرسکتے تھے اور اقتصادی ترقی کا رُخ اپنی مرضی کے مطابق متعین کرسکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اور تکنیکی امداد فراہم کرتے ہوئے ان ملکوں کی اقتصادی منصوبہ بندی کو اپنے طابع کرنے کی کوشش کی۔

1954ء میں، یعنی اس وقت جب پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوفوجی معاہدوں پر دستخط ہوئے تھے، امریکی مشیر ایک بڑی تعداد میں پاکستان آنا شروع ہوگئے۔ ان مشیروں کی سرگرمیوں کا مرکز منصوبہ بندی کا ادارہ، پلاننگ بورڈ تھا جس کو قائم کیے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ حکومت پاکستان نے امریکہ کی ہارورڈ (Harvard) یونیورسٹی اور فورڈ فاؤنڈیشن کے ساتھ ایک سمجھوتے پر دستخط کیے۔ جس کی بدولت بیرونی مشیروں کا پلاننگ بورڈ میں تقرر کیا گیا تاکہ وہ پاکستان کے پہلے پنج سالہ منصوبہ کی تیاری میں ہاتھ بٹائیں۔ پاکستان میں ان مشیروں کی جماعت کی قیادت ڈیوڈ بیل (David Bell) نے کی، جس کو بعد میں پاکستان میں امریکہ کے امدادی ادارے، اے آئی ڈی (A.I.D) کا سربراہ اور آخرکار واشنگٹن میں اس ادارہ کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں اس پروگرام کی نگرانی کا کام مشہور ماہر معاشیات ایڈورڈ میسن (Edward Mason) کے حوالے کیا گیا۔ یہ پروگرام بعد میں ڈیولپمنٹ ایڈوائزری سروس (Development Advisory Service) یا 'ڈاس' (DAS) کے نام سے مشہور ہوا۔

پلاننگ بورڈ، تنظیمی کمزوریوں اور تربیت یافتہ عملہ کی کمی کی وجہ سے امریکی مشیروں کا محتاج ہوگیا، اور اس کی تمام کارکردگی ان کے ہاتھوں میں آگئی۔ عالمی بینک (World Bank) کی جانب سے تیار کردہ اپنی رپورٹ میں امریکی معاہر معاشیات واٹرسٹن (Waterston) نے لکھا ہے کہ ''پہلے پانچ سالہ منصوبہ کے بیشتر اہم حصے ہارورڈ گروپ نے تیار کیے تھے۔'' (۵۴) آدم کرل (Adam Curle) نے جو فرد تعلیمی امور کے مشیر تھے، ایک دوسرے تعلیمی مشیر جارج

گرانٹ (George Grant) کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے 'پہلے پانچ سالہ منصوبے میں تعلیم کا باب لکھنے میں بہت اہم کردار ادا کیا'' (۵۵) غرض کہ پاکستان کا پہلا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ پاکستانی پلاننگ بورڈ میں تیار ہونے کے باوجود حقیقت میں امریکی تخلیق تھا۔ لیکن امریکیوں نے پانچ سالہ منصوبہ بنانے کی حد تک قناعت نہیں کی۔ بلکہ 'مشیروں نے سالانہ ترقیاتی پروگراموں کا بیشتر کام بھی کیا، جس سے بال آخر پہلے منصوبہ کو عملی جامہ پہنچانے کی بنیاد قائم ہوئی۔'' (۵۶) ہر صوبائی منصوبہ بندی ادارے میں بھی دو ہارورڈ کے مشیر فائز کیے گئے۔ جہاں انہوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور معنی خیز کام سرانجام دیا۔ (۵۷)

پاکستان کی اقتصادی منصوبہ بندی کرنے والے اس اہم ادارے میں قدم جمانے کے بعد امریکی مشیروں کو اس ادارے کے مستقبل کی فکر پڑ گئی۔ انہوں نے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ پلاننگ بورڈ کو ایک مستقل ادارہ بنا دیا جائے (۵۸)۔ امریکی مشیروں کے زیر اثر بورڈ نے پہلے ہی اپنے فرائض کا دائرہ سرکاری شعبہ میں صنعت کاری سے بڑھا کر 'عام اقتصادی پالیسی' کر دیا تھا (۵۹)۔ لیکن افسر شاہی کی لکیر کی فقیری اور وزارتوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے بورڈ اتنا موثر کردار ادا نہیں کر سکتا تھا جتنا کہ امریکی مشیر چاہتے تھے۔ لہٰذا ایک طرف تو انہوں نے حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ وزارتوں کے لیے 'تکنیکی امداد' قبول کر کے وہاں بھی منصوبے پر عمل کرانے کے لیے غیر ملکی مشیر بٹھا دے (۶۰) اور دوسری طرف وہ پلاننگ بورڈ کے لیے مزید اختیارات کا مطالبہ کرتے رہے۔

دریں اثناء پاکستان کے دوسرے ترقیاتی پانچ سالہ منصوبے کی تیاریاں جاری رہیں۔ یہ منصوبہ بھی ہارورڈ گروپ کے زیر اثر تیار کیا گیا (۶۱)۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پر عمل کیا جا سکے، جنرل ایوب خان نے حکومت کا تختہ الٹ کر پاکستان کو مزید امریکہ کی گود میں دھکیل دیا۔ انہوں نے ایک مہینے کے اندر اندر امریکی مشیروں کے دل کی مراد پوری کر دی، یعنی منصوبہ بندی کے ادارے کی از سر نو تنظیم کر کے اسے مزید اختیارات دے دیے اور اس کو پلاننگ کمیشن (Planning Commission) کا نیا نام دیا گیا۔ یہ ہارورڈ گروپ کے مشیروں کے سنہرے دن تھے۔ پاکستان کی معیشت کے بارے میں فیصلے کرنے میں انہیں مزید اختیارات فراہم ہوئے۔ تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے متعلق ڈاس (یعنی ہارورڈ گروپ) کے ایک مشیر ووٹر ٹمس (Wouter Tims)، نے لکھا'' کہ اس کے

تمام ابواب گروپ کے مشیروں نے لکھے ان کی کثیر امداد سے لکھے گئے۔" (۶۲)

حکومت پاکستان کے حلقوں میں منصوبہ بندی ادارے اور وزارتوں کے درمیان تنازعہ کو محض ماہر شاہی (Technocracy) اور افسر شاہی کی رسہ کشی تصور کیا جارہا تھا (۶۳) لیکن پس پردہ سامراج کے سازشی ہاتھ کارفرما تھے جو اپنے مقبوضہ ادارے کی خودمختاری اور بالادستی کے لیے کوشاں تھے۔ اس طرح سے غیر ملکی مشیروں نے پاکستانی ماہرین معاشیات کا ساتھ دیا تاکہ وہ نجی ملکیت کے موقف کو فروغ دے سکیں۔ افسر شاہی نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سرکاری شعبہ میں سرمایہ کاری کے نظریہ کی آڑ لی۔ ایوب خان جو کسی طرح سے بھی افسر شاہی کے دشمن نہ تھے، منصوبہ بندی ادارے کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن منصوبہ بندی ادارے کے ہاتھوں میں اعلیٰ اختیارات آنے کا سبب محض ان کا انتظامی فیصلہ نہیں تھا۔ امداد فراہم کرنے والے ملکوں اور بین الاقوامی اداروں نے رفتہ رفتہ اسے جائز 'سودہ کاری کا ایجنٹ' (Bargaining Agent) تسلیم کرلیا تھا۔ بقول ماہر معاشیات اسٹیفن لوئیز (Stephen Lewis) 'بیرونی امداد کے اعلیٰ ادارے کی حیثیت سے بقایا افسر شاہی کے مقابلہ میں اس کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ نجی شعبہ پر سے رکاوٹیں ہٹانے کے کام کو تقویت دے سکے۔" (۶۴)

لہٰذا تکنیکی امداد سے فیضیاب ہونے والے اور بیرونی امداد کے لیے سودہ کاری کرنے والے ادارے ہونے کی وجہ سے منصوبہ بندی کمیشن، جسے دراصل سرکاری شعبہ کے فروغ کے لیے قائم کیا گیا تھا، بالآخر نجی ملکیت کا سب سے موثر محافظ بن کر رہ گیا۔

1969ء میں ایوب خان کے زوال کے وقت تک ڈاس کے تقریباً 80 مشیر پاکستان میں اپنی خدمات انجام دے چکے تھے۔ ایوب شاہی کا تختہ اُلٹنے کی وجہ سے منصوبہ بندی کمیشن کمزور پڑ گئی اور ہارورڈ گروپ کا اثر و رسوخ بھی کم ہو گیا (۶۵)۔ لیکن اب انہیں یہاں پر زیادہ دیر تک رہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے یہاں ایک ایسا ڈھانچہ کھڑا کر دیا تھا اور اقتصادی منصوبہ بندی کا ایسا نظریہ رائج کر دیا تھا جو سامراج کے مفادات اب از خود مقامی دلالوں اور پالتو طوطوں کے ذریعے پورے ہو سکتے تھے، انہیں اب انڈونیشیا اور گھانا کے سرسبز باغ پکار رہے تھے، جہاں سامراجیوں نے حال ہی میں سوئیکارنو، اور انکروما کی قوم پرست حکومتوں کا تختہ الٹنے کے بعد ان ملکوں کی معیشت کو اپنے تابع کرنے کا کام ہارورڈ کے ڈاس گروپ کو سپرد کیا تھا۔

منصوبہ بندی کمیشن کو ملنے والی تکنیکی امداد فقط ہارورڈ، عالمی بینک اور دیگر اداروں کے مشیروں کی صورت میں ہی نہیں تھی۔ پاکستانی عملے سے اپنے فلسفہ اور مفاد کے مطابق کام لینے کے لیے باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ کچھ پاکستانی ماہرین معاشیات کو کام پر ہی تربیت دی گئی، جبکہ دوسروں کو وظیفے دے کر امریکہ تربیت لینے کے لیے بھجوایا گیا۔ انکے سامراجی اقتصادی نظریہ کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے اور اپنے محسنوں کے ساتھ رابطہ جاری رکھنے کے لیے آج بھی امریکہ اور دیگر سامراجی ممالک میں قلیل مدت والے مذاکرے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کا ایک کورس عالمی بینک کے ادارہ برائے اقتصادی ترقی (Economic Development Institute) کی طرف سے اور فورڈ فاؤنڈیشن اور راکیفیلر فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے ہر سال واشنگٹن میں پیش کیا جاتا ہے(٦٦)۔ پاکستانی منصوبہ بندی کمیشن کے افسران اس کو اس میں باقاعدہ شریک ہوتے رہتے ہیں۔

اقتصادی تعلیم و تحقیق:

پاکستان میں موثر طریقے کی کارگزاری کرنے کے لیے یہ کافی نہیں تھا کہ وہ فقط منصوبہ بندی کمیشن اور وزارتوں میں اپنے قدم جمائے رکھیں۔ منصوبہ بندی کرنے کے لیے انہیں اعداد و شمار اکٹھا کرنے، جائزہ لینے، تحقیق کرنے اور اقتصادیات مضمون میں تربیت دینے کے مکمل لوازمات کی ضرورت درپیش تھی۔ ایسے اداروں کا یا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا اور اگر تھے بھی تو ایسے دقیانوسی قسم کے تھے جو جدید سامراج کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا شروع میں پرانے اداروں کی اصلاح اور نئے اداروں کے قیام کا کام عمل میں لایا گیا۔

سی ایس ۔او: اعداد و شمار جمع کرنے اور جائزہ لینے کے لیے سینٹرل اسٹیٹسٹیکل آرگنائزیشن (Central Statistial Organization) یعنی مرکزی شماریاتی تنظیم، جسے سی۔ ایس۔او (C.S.O) کے نام سے پکارا بھی جاتا ہے۔ قائم کی گئی۔ اس تنظیم نے اعلیٰ عہدوں پر یا تو افسر شاہی کے نمائندے یا امریکہ پلٹ پیشہ ور ماہرین فائز کیے گئے۔ نچلے عملے کو امریکہ میں تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ سی ایس او میں وقتاً فوقتاً امریکی مشیر مامور کیے گئے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی ترقی پذیر اور جدید ملک میں اقتصادی و سماجی منصوبہ بندی کے

لیے اس قسم کے اداروں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سی ایس او کا قیام سماجی بہبود کے نکتہ نظر سے نہیں، بلکہ جدید سامراج کی ادارتی تعمیر کی غرض سے کیا گیا تھا۔

سی آئی ڈی ای: پاکستانی یونیورسٹیوں میں نہ تو سماجی علوم پر سائنسی تحقیق کرنے کی سہولتیں موجود تھیں اور نہ ہی انہیں آسانی سے نئی بنیادوں پر کھڑا کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا علم اقتصادیات میں جدید سامراجی ڈھنگ سے تحقیق کروانے کی غرض سے امریکی سرمایہ دارانہ 'خیراتی' ادارے فورڈ فاؤنڈیشن کی مالی مدد سے کراچی میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس (Pakistan Institute of Development Economis) یا پی آئی ڈی ای (PIDE) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کے پہلے ڈائریکٹر ایمیل ڈیسپرے (Emile Desperes) تھے جو کہ بعد میں تصدیق شدہ امریکی جاسوس یعنی سی۔ آئی۔ اے (CIA) کے ایجنٹ ثابت ہوئے۔ (٦٧) اس ادارے میں ابتدا سے ہی امریکی اور دوسرے غیر ملکی مشیروں کی بہتات تھی۔ ادارے کے زیادہ تر کام کی پہل یہی غیر ملکی ماہرین کیا کرتے تھے، اور پاکستانی عملہ بطور معاون ان کی بتائی ہوئی راہ پر عمل درآمد کیا کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ پی آئی ڈی ای کے تمام مشیر اور تمام پاکستانی ملازمین شعوری طور پر سامراج کے ایجنٹ تھے۔ درحقیقت ان میں چند ایک تو سخت سامراج دشمن خیالات کے مالک تھے۔ بظاہر پی۔ آئی۔ ڈی۔ ای کے عملہ پر کسی قسم کا بھی دباؤ نہیں ڈالا جاتا تھا کہ وہ غلامانہ طرز سے سوچیں اور تحقیق کریں۔ لیکن تکنیکی مہارت کی آڑ میں ایک لاشعوری، نفسیاتی عمل کارفرما تھا جس کی وجہ سے اس ادارے کا عملہ مجموعی طور پر سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظریہ اقتصادیات کو اپنانے پر مجبور ہوگیا تھا۔

پی۔ آئی۔ ڈی۔ ای (PIDE) میں فائز غیر ملکی ماہرین کی اکثریت کو سرمایہ دارانہ اقتصادیات کے علاوہ کسی اور اقتصادی سائنس کا علم نہیں تھا۔ معاشی ترقی سے ان کی مراد جدید سامراجی ڈھانچہ میں رہتے ہوئے، غیر ملکی امداد کے ذریعہ چند مخصوص شعبوں میں ترقی تھی۔ ادارے کے پاکستانی نوجوان ملازم اپنی تعلیمی کمزوریوں اور غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے ان مشیروں سے بہت جلد مرعوب ہوجاتے تھے۔ مزید یہ کہ متوسط طبقہ کی موقع پرستی کی وجہ سے ان کے سماجی پس منظر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو انہیں سرمایہ دارانہ اقتصادیات کی خرافات کے خلاف

بغاوت کرنے پر آمادہ کرے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کے گھٹیا معیار اور نراجی حالات کے مقابلہ میں اس ادارے کا ماحول نسبتاً تازہ اور دلکش دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا پاکستانی عملے کی اکثریت کے لیے یہ ادارہ علمی، مالی اور سماجی رتبہ کے لحاظ سے خاطر خواہ تسکین کا باعث تھا۔ نیز انہیں امریکہ کی شہرت یافتہ درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے مستقبل کو مزید روشن کرنے کے بھی مواقع فراہم کرتے۔ یہی وہ مادہ و مایہ ہے جس سے جدید سامراج اپنی اداراتی تعمیر کرتا ہے اور کسی ملک کو بالواسطہ طور پر اپنے زیر دست کرتا ہے۔

آئی۔پی۔بی۔اے: جدید سامراجی دور کے تقاضوں کے پیش نظر خانگی، تجارتی، اور صنعتی انتظامیت کے روایتی طریقے فرسودہ ہو چکے تھے، لہٰذا اب انہیں از سر نو تربیت دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کام کے لیے امریکہ کی پنسلوانیا یونیورسٹی (University of Pennsylvania) کے علم تجارتی انتظامیت کے ادارہ (School of Business Administration) کی مدد سے کراچی میں انسٹی ٹیوٹ آف پبلک اینڈ بزنس ایڈمنسٹریشن (Institute of Public and Business Administration) یا آئی پی۔بی۔اے (I.P.B.A) قائم کیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی میں کامرس کے شعبے کو بند کر دیا گیا، اور نئے ادارے میں امریکی طرز کا نصاب رائج کیا گیا۔ اس ادارے کے ایم بی اے (M.B.A) ڈگری یافتہ امیدواروں کو نجی کمپنیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ یہ ماہر فنی اعتبار سے قابل ہونے کے علاوہ نظریاتی طور پر سرمایہ داری اور امریکی طریق عمل کے ترجمان بھی بن گئے۔

گو بیرونی ممالک میں تربیت پانے والا ہر پاکستانی ماہر معاشیات لازمی طور پر سامراج کو آلہ کار نہیں ہے، پھر بھی مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے کی ہوئی تربیت بالآخر سامراج کو ہمارے ملک میں اپنے عزائم کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر کے ذاتی مفادات سامراج کے ساتھ اس قدر منسلک ہو گئے ہیں کہ انہیں اپنے طرزِ عمل میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ وہ عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF) اور دیگر سامراجی اداروں میں کام کرنے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کا ایک پاؤں اسلام آباد میں تو دوسرا واشنگٹن میں ہو، سردیاں پاکستان میں گزریں تو گرمیاں سوئیٹزرلینڈ میں۔ پاکستان کے اعلیٰ حکام اور افسروں میں ہمیں ایسے کئی لوگ ملیں گے جو حکومت پاکستان اور

کسی سامراجی ادارے کی بیک وقت ملازمت کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے سرِ فہرست جناب محمد شعیب کا نام آتا ہے۔ جب انہیں ایوب خان نے پاکستان کا وزیر خزانہ مقرر کیا تو وہ واشنگٹن میں عالمی بینک کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ وہ اس عہدے سے مستعفی ہوئے بغیر ہی وزیر خزانہ کا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے نجی سرمایہ داری اور سامراجی مفادات کی جو خدمت کی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا ''صدر کے وزیر خزانہ ایک بیرونی طاقت کے ملازم تھے'' (۶۸)۔ 1966ء میں وزیر خزانہ کے عہدے سے سبکدوش ہوتے ہی انہوں نے واشنگٹن میں عالمی بینک کے نائب صدر کے فرائض سنبھال لیے۔ یہ ہی حال ڈاکٹر محبوب الحق کا ہے۔ جنہوں نے منصوبہ بندی کمیشن کے چیف اکنامسٹ کی حیثیت سے پاکستان کی معیشت کو مفلوج سرمایہ داری کی راہ پر لگانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے اپنی کتاب میں انتہائی وضاحت سے اس نظریہ کا پرچار کیا تھا کہ اقتصادی ترقی کی خاطر سماجی بھلائی اور عوامی مفاد کو ترک رکنا ہوگا (۶۹)۔ یہ بھی وقتاً فوقتاً بین الاقوامی اداروں کے ملازم رہے اور آج بھی ان کا تعلق عالمی بینک سے ہے۔ عزیز علی محمد جو کہ مستقل طور پر بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے ملازم ہیں، مختلف اوقات پر پاکستان میں قلیل مدت کے لیے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ انکے علاوہ بھی ایسے متعدد ماہرین معاشیات ہیں جو کبھی حکومت پاکستان کے تو کبھی سامراجی اداروں کے تنخواہ دار ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی بدولت سامراجی اداروں اور حکومت پاکستان کے شعبوں کے مابین رابطہ جاری رکھا جاتا ہے اور پاکستان کی معیشت کو سامراج کے مفادات اور نظریہ کے تابع رکھا جاتا ہے۔

سامراجیوں اور گماشتہ سرمایہ داروں کے درمیان رابطہ کے ادارے:

جدید سامراجی نظام کو چلانے کے لیے اتنا کافی نہیں کہ مجموعی طور پر ملک کی منصوبہ بندی سامراجیوں اور ان کے مقامی دلالوں کے حق میں ہو۔ سامراجی سرمایہ داروں اور مقامی گماشتہ سرمایہ داروں کے درمیان لین دین کے لیے مخصوص اداروں کا قیام عمل میں لانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اس غرض سے، بین الاقوامی سامراجی اداروں اور امریکی حکومت کی کوششوں سے پاکستان میں کئی ادارے قائم کیے گئے۔ ان میں سے تین اہم اداروں کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔

PICIC پیک:

1957ء میں عالمی بینک کے مشورہ سے پاکستانی صنعتی قرضہ اور سرمایہ کاری کی کارپوریشن (Pakistan Industrial Credit and Investment Corporation) یعنی پیک (PICIC) کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کے 37 فیصد حصص غیر ملکی نجی سرمایہ داروں اور عالمی بینک کے ذیلی ادارے، بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن (International Finance Corporation) یا آئے۔ ایف۔ سی (IFC) کے ہاتھوں میں ہے۔ پیک کے بورڈ آف گورنرز کے 20 ممبروں کی تقسیم حسبِ ذیل ہے: چار غیر ملکی سرمایہ داروں کے نمائندے، ایک آئے۔ ایف۔ سی کا نمائندہ، سات حکومت پاکستان کے نمائندے، اور سات پاکستانی سرمایہ داروں کے نمائندے۔ یہ ادارہ پاکستان کے نجی سرمایہ داروں کے لیے غیر ملکی امداد اور سرکاری امدادی رقم فراہم کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ 1958ء سے لے کر 1975 تک پیک نے 648 صنعتی منصوبوں کے لیے چار ارب 21 کروڑ 3 لاکھ روپے کے زرمبادلہ میں قرضے منظور کیے ہیں (۷۰)۔

پاکستانی سرمایہ داروں کو غیر ملکی سرکاری امداد پہنچانے کے علاوہ 'پیک نے چند غیر ملکی اور پاکستانی سرمایہ کاروں کو قریب لانے میں مدد دی۔'' (۷۱)

پی۔ آئی۔ ڈی۔ بی: پاکستانی صنعتی ترقی کا بنک (Industrial Development Bank of Pakistan) یا پی۔ آئی۔ ڈی۔ بی ہی (IDBP) بھی پیک کی طرح پاکستانی سرمایہ داروں کو غیر ملکی امداد پہنچانے کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ 1961ء سے 1974ء تک اس نے ایک ارب 36 کروڑ 80 لاکھ 40 ہزار روپے کے زرمبادلہ میں قرضے دیے (۷۲)۔ اس میں بھی سامراجیوں کا کافی اثر ورسوخ ہے۔ اسی ادارے میں مختلف اوقات پر غیر ملکی مشیر رہے ہیں۔

آئے۔ اے۔ سی پی: ''سمجھ بوجھ'' کے ساتھ نجی سرمایہ کاری کرنے کو فروغ دینے کے لیے امریکی امدادی ادارے، اے۔ آئے۔ ڈی (AID) نے سی ڈبلیو رابنسن کمپنی (C.W.Robinon Co.) کو ٹھیکہ دے کر سرمایہ کاری کا مشاورتی مرکز (Investment Advisory Centre of Pakistan) یا آئے۔ اے۔ سی۔ پی (IACP) کا قیام عمل میں لایا۔ اس ادارے کے فرائض

حسب ذیل ہیں:

غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کے لیے میدان ہموار کرنا، پلک اور پی آئی ڈی بی کے لیے قرضوں کی درخواستوں، سرمایہ کاری کی تجاویز اور سرمایہ کاری کے امکانات کا جائزہ لینا۔ اس کے علاوہ اس ادارے کے امریکی تربیت یافتہ عملے کا یہ بھی کام ہے کہ وہ پاکستانی سرمایہ کاروں کو 'پیشہ ورانہ' مشورہ دیں۔ (۷۳)

آئے۔ اے۔ سی۔ پی کے کردار کا اندازہ ۱۹۶۶ء میں ہونے والی اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے بھی ہوسکتا ہے کہ جو اس نے پاکستان مینجمنٹ ایسوسی ایشن (Pakistan Management Association) کے ساتھ مل کر کی تھی۔ اس کانفرنس کے بیان کردہ مقاصد یہ تھے:

"پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کا ارادہ رکھنے والے سرمایہ داروں کو سرمایہ کاری کی فضا، مواقع اور فوائد کے متعلق معلومات فراہم کرنا، اور انہیں پاکستانی سرکاری افسروں اور بزنس منتظمین کے ساتھ ملانے کے مواقع فراہم کرنا۔

"پاکستان میں سرکاری افسروں کو اس قابل بنانا کہ وہ ایک ترقی پذیر ملک میں اس قسم کی بزنس فضا کی قدر کرسکیں جو سرمایہ کاری کے امیدواروں کو مشترکہ منصوبوں اور لائسینسی معاہدوں میں شریک ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔

"پاکستانی سرمایہ کاروں اور صنعت کاروں کو ان مناسب انتظامی کاروائیوں اور طریقوں سے آگاہ کرنا جن سے غیر ملکی سرمایہ کاروں کو مشترکہ منصوبوں اور لائسینسی معاہدوں میں شامل ہونے کی کشش پیدا ہوتی ہے۔

"غیر ملکی سرمایہ کاری کے امیدواروں اور پاکستان میں پہلے سے موجود غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے رکاوٹ پیدا کرنے والے حالات اور طریقوں کا جائزہ لینا۔ (۷۴)

غیر ملکی اور پاکستانی سرمایہ داروں کے مابین تعلقات اور اشتراک کو تقویت دینے کی غرض سے سامراجی ممالک چیمبر آف کامرس، انوسٹمینٹ پروموشن بیورو، مینجمنٹ ایسوسی ایشن اور دیگر اداروں کو بھی کانفرنس منعقد کرنے اور دیگر سرگرمیوں کے لیے امداد دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا اداروں کا پاکستان کی معیشت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے لیکن سامراجی اپنا اثر ورسوخ جمانے کے لیے ہر قسم کے سماجی، سیاسی، ثقافتی، ادبی اور تعلیمی اداروں میں اپنے پنجے گاڑ دیتے ہیں اور انہیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بال آخر ان مفادات کی نوعیت معاشی ہی ہوتی ہے۔ جدید سامراجی دور میں سامراج کے مفادات کے پیدا ہونے کا مطلب کم وبیش یہی ہوتا ہے کہ محکوم ممالک کی پیداواری قوتیں آگے نہ بڑھیں اور وہ پسماندگی اور محتاجی کے جال میں پھنسا رہے۔ پاکستان میں جدید سامراج کی ادارتی تعمیر کے جو نتائج نکلے ہیں اس کا تجزیہ ہم آئندہ ابواب میں پیش کریں گے۔

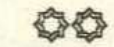

چوتھا باب

معاشی ترقی یا مسلسل پسماندگی

''اس ایکٹ کے دفعہ 201 کے تحت کسی بھی ملک میں ایسی پیداواری صنعت کی تعمیر یا کارکردگی کے لیے امداد نہیں دی جائے گی جہاں ایسی صنعت امریکی صنعت سے مقابلہ کرتی ہو۔''

خارجی تعلقات کا قانون، امریکہ 1967ء

آج سے چند سال پہلے تک سامراجی ممالک کے حکام اور اخبارات پاکستان کی اقتصادی ترقی کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے اور پاکستان کو پسماندہ ملکوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ اس مبالغہ آمیز تعریف کی ایک مثال نیویارک ٹائمز کا سنہ 1965ء میں لکھا ہوا وہ اداریہ ہے جس میں لکھا تھا کہ:

''ہوسکتا ہے کہ پاکستان ایک ایسے اقتصادی سنگ میل پر پہنچنے کو ہے جہاں اب تک کثیر آبادی والا فقط ایک اور ملک یعنی امریکہ پہنچا ہے۔''(۷۵)

پاکستان کی اقتصادی ترقی کی اس فراخدلی کے ساتھ تعریف کرنے کا مطلب درحقیقت یہ تھا کہ پاکستان نے جس سختی اور وفاداری کے ساتھ بیرونی امداد کی شرائط پر عمل کیا تھا اس سے سامراجی بے حد مطمئن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان نے بدنام زمانہ سامراجی ماہرین معاشیات ملیکن (Millikan) اور راسٹاؤ (Rostow) کی پیش کردہ بیرونی امداد حاصل کرنے کی چاروں شرائط پوری کردی تھیں۔ ان شرائط میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ:

(امداد) ''حاصل کنندہ ملک کی قومی ترقیاتی پروگرام بڑھتی ہوئی عالمی تجارت کی ضروریات اور بین الاقوامی تقسیم محنت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔'' (۷۶)

بہرکیف، ماہرین معاشیات نے خطوط وخمار کی نمائش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان کی اقتصادی ترقی کی شرح بہت تیز تھی، اور اس ترقی خاص طور پر صنعتی ترقی، کی سب سے اہم وجہ بیرونی امداد تھی (۷۷)۔ اعداد وشمار یہ بھی بتاتے ہیں کہ 1960ء کی دہائی کے وسط میں پاکستان کی زراعت میں بیرونی تعاون سے جو ''سبز انقلاب'' برپا ہوا تھا اس کے نتیجہ میں ملک کی زرعی پیداوار میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ اگر یہ سب کی سب باتیں سچی بھی ہوں تو بھی وہ بنیادی سوالات کے جواب دینے سے عاری ہیں۔ ہر ترقی پذیر ملک کو جن بنیادی سوالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہیں: اقتصادی ترقی نے کسی حد تک ملک کی پیداواری قوتوں کو آزاد کیا ہے؟ کیا ترقی عوام کی ضروریات کے مطابق ہوئی ہے؟ ایسی ترقی سے سماجی ڈھانچہ اور سماجی تعلقات پر کیا اثر پڑا ہے؟ بہ الفاظ دیگر، اس ترقی نے ملک کو حقیقی آزادی اور سماجی انصاف کی منزل کے کتنا قریب پہنچا ہے؟ پاکستان کے معاشی تغیر کو اگر ان نکات کی روشنی میں جانچا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایسے تغیر کو صحیح معنوں میں ترقی نہیں کہا جا سکتا۔

صنعت کاری کا دائرہ:

موجودہ دور میں ایک زرعی ملک کی ترقی میں بھی صنعت ہراول جزو کا کردار ادا کرتی ہے۔ صنعت کاری فقط اسی وقت معنی خیز ہوتی ہے جب وہ اشیاء صرف پیدا کرنے کے علاوہ ذرائع پیداوار بھی پیدا کرے، جس سے پیداواری قوتیں اور آگے بڑھیں۔ ایک زرعی ملک کی حقیقی صنعتی ترقی کے لیے یہ لازمی ہے کہ یہ ترقی زرعی ذرائع پیداوار مہیا کرے اور زرعی معیشت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایسا توازن پیدا کرے جس سے وہ اپنی ہراول جزو کی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے شہر اور دیہات، صنعت اور زراعت اور مزدور وکسان کے درمیان بے جا تفریق نہ بڑھائے اور عوام کی بنیادی ضروریات کو پورا کرے۔

پاکستان میں جدید سامراجی اثر کے تحت اور بیرونی امداد کے ذریعہ جو اقتصادی ترقی ہوئی

ہے اس پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ملک کی اقتصادی منصوبہ بندی میں صنعتی ترقی کو کبھی خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی۔ جو صنعت کاری کی بھی گئی ہے وہ پیداواری قوتوں کو آگے بڑھانے کی بجائے الٹا سامراج کی بین الاقوامی معیشت میں ہمارے ملک کی زیر دست حیثیت کو مستحکم کرتی ہے۔

غیر ملکی امداد میں صنعت کاری کو جو ثانوی حیثیت دی گئی ہے، اس کا اندازہ ہمیں ان اعداد و شمار سے ہوتا ہے کہ سنہ 1970ء تک مہیا ہونے والی سات ارب ڈالروں کی امداد میں سے فقط ایک ارب ڈالر صنعتی شعبے کے لیے منظور کیے گئے، جس میں سے درحقیقت فقط 85 کروڑ ڈالر ادا کیے گئے (۷۸)۔ یاد رہے کہ یہاں پر ''صنعتی شعبہ'' کی تعریف کافی وسیع معنوں میں کی گئی ہے۔ صنعت کے تحت دکھائی گئی رقم کا ایک بھاری حصہ مختلف قسم کی ''خدمات'' پر خرچ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، سنہ 1957ء میں صنعت کے لیے دیے جانے والے عطیوں میں سے 20 فیصد سے زیادہ رقم انتظامیہ، جائزہ لینے، تحقیق کرنے اور دیگر سرگرمیوں پر خرچ کی گئی تھی۔ (۷۹)

مخصوص صنعتوں، مثلاً کیمیائی کھاد کے کارخانے وغیرہ کے تحت دکھائی جانے والی بھاری بھاری رقمیں کلی طور پر مشینوں اور مال کی خرید پر استعمال نہیں کی جاتیں۔ ان کا ایک بڑا حصہ ''تیکنیکی امداد'' کی صورت میں ہوتا ہے، یعنی وہ غیر ملکی مشیروں وغیرہ پر خرچ ہو جاتا ہے۔

غیر ملکی اقتصادی امدادی پروگراموں میں اکثر گماشتہ سرمایہ داری کے ذیلی ڈھانچے کی تعمیر پر خرچ کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ خاص طور پر، عالمی بینک کے قرضوں کی تو یہ ہی خصوصیت ہے۔ پاکستان میں بیرونی امداد کا 35 فیصد بجلی و آبپاشی، نقل و حمل اور مواصلات کے ذرائع پر خرچ ہوا ہے۔

سامراجی ملک اول تو صنعتی ترقی کے لیے امداد دینا پسند نہیں کرتے۔ اگر وہ کوئی رقم مہیا کرتے بھی ہیں تو مخصوص قسم کی صنعت لگانے کے لیے جو ان کے اپنے مفاد میں ہو۔ مگر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ حکومت پاکستان سامراجیوں کو اپنے پسندیدہ شعبوں میں سرمایہ کاری کرنے دے اور ملکی سرمایہ کو ان شعبوں کی بجائے صنعت پر لگا دے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بتا چکے ہیں، پاکستان کی مجموعی اقتصادی منصوبہ بندی سامراجی مفادات کے دائرے میں ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ سامراجی جب کسی مخصوص پروجیکٹ کے لیے امداد فراہم کرتے ہیں تو اول اس کا انتخاب وہ خود کرتے ہیں اور دوئم اسکے ساتھ کئی شرائط عائد کرتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خود کل منصوبے

کا جزوی خرچ برداشت کریں گے اور باقی میزبان ملک کو مہیا کرنی ہوگی۔ اس طرح سے "اپنی مدد آپ کرو" کے نعرے کے تحت وہ سینکڑوں منصوبوں میں دوانی چونی ڈال کر میزبان ملک کے مالی ذرائع کے کثیر حصہ کو اپنی پسندیدہ اسکیموں میں پھنسا دیتے ہیں۔ لہٰذا معمولی امداد دینے کے باوجود ترقیاتی اسکیموں کی ایک کثیر تعداد پر وہ اپنی چھاپ نصب کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اگر مجموعی ترقیاتی منصوبہ میں غیر ملکی امداد کا تناسب زیادہ ہو تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قدر ان کی منشا کے مطابق ہوگا۔ نیز، جب کہ وہ صنعتی ترقی کے بنیادی طور پر مخالف ہوں تو سمجھ لیجئے کہ ایسے منصوبوں میں صنعت کاری کو کس قسم کی فوقیت دی گئی ہوگی۔ پاکستان کے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کا تو یہ عالم ہے کہ وہ نہ فقط امریکی مشیروں اور ان کے طوطوں کے بنائے ہوئے ہیں بلکہ اُن پر خرچ ہونے والی لاگت کا ایک وسیع حصہ غیر ملکی ذریعوں سے فراہم کیا گیا ہے۔ غیر ملکی قرضوں کا تناسب پہلے پانچ سالہ منصوبہ میں 35 فیصد، دوسرے منصوبہ میں 50 فیصد اور تیسرے میں 26 فیصد تھا (۸۰)۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد داخلی اقتصادی قوتوں کے دباؤ کے تحت کپڑے کی صنعت میں جو ترقی ہوئی اس کے بعد ملک کے صنعتی ارتقاء کی راہ میں روڑے اٹکا دیے گئے۔ آج بھی پاکستان کی مجموعی دولت کا 16 فیصد سے کم حصہ مصنوعات سے تشکیل پاتا ہے۔ (۸۱)

مصنوعات کی نوعیت:

سرمایہ دارانہ علم معاشیات میں لفظ مصنوعات جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس کا مطلب لازمی طور پر صنعت کاری نہیں ہے۔ چائے جیسی زرعی پیداوار کو جب کارخانے میں پروسس کر کے نکالا جاتا ہے تو وہ بھی مصنوعات میں شامل ہوجاتی ہے۔ پاکستان کی مصنوعات پر سرسری نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کل مصنوعات کا ایک چوتھائی سے زائد حصہ چھوٹے پیمانے کی مصنوعات پر مشتمل ہے (۸۲)۔ مصنوعات کی ترکیب کا تفصیل سے تجزیہ کیا جائے (گوشوارہ 4) تو ہمیں مندرجہ ذیل صورت نظر آئے گی:۔

(۱) کپڑے کی صنعت کے علاوہ، جو مخصوص حالات میں پروان چڑھی تھی اور جس کی ابتدائی ترقی صنعتی سرمایہ دار طبقے کے اپنے ارتقاء کی لازمی شرط تھی، پاکستان کی مصنوعات کا سب سے کثیر حصہ کھانے پینے کی اشیاء پر مشتمل ہے۔ غذائی صنعت کا 80 فیصد سرمایہ شکر اور گھی کی

بدنام زمانہ صنعتوں میں لگا ہوا ہے۔ ان دونوں صنعتوں نے عوام کی ضروریات کو جس حد تک پورا کیا ہے اور اُن سے جو دام وصول کیے ہیں اس کی حقیقت پاکستان کے عوام پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ دونوں صنعتیں انتہائی نااہل ہیں اور سرکاری رعایتی رقم یا اعانت (Subsidy) پر ان کا دارومدار ہے۔ شکر کی کم از کم 9 ملوں کو غیر ملکی امداد فراہم کی گئی ہے تاکہ وہ صنعتی الکحل پیدا کر کے سامراجی ملکوں کو برآمد کریں۔ اگر کپڑے کی صنعت کے بعد غذائی اشیاء کی صنعت ہی سب سے اہم ہے تو ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ بقایا صنعتوں کا کیا عالم ہوگا، ان کا عوام کی ضروریات کے ساتھ کیا تعلق ہوگا۔

گوشوارہ نمبر ۴

پاکستان کی اہم صنعتوں کے سرمائے اور قدر کی فیصد ترکیب

صنعتی گروپ	مستقل سرمایہ	قدر میں سالانہ اضافہ
غذائی اشیاء	14.04	14.77
تمباکو	1.38	7.97
کپڑا	34.43	32.30
کیمیائی مصنوعات	13.34	8.91
پیٹرول اور کوئلے کی مصنوعات	3.24	7.98
غیر دھاتی معدنیات	11.24	4.32
بنیادی دھاتیں	2.59	2.41
مشینری (بجلی کے علاوہ)	1.49	1.20
بجلی کی مشینری	2.90	3.33
نقل و حمل کا سامان	2.65	1.40
متفرق	1.27	15.41
کل	100	100

Source: Census of Manufacturing Industries, 1969-70

(۲) غذائی اشیاء کی صنعت کے بعد سب سے اہم مقام کیمیائی صنعت کا ہے۔ یہ کمپنیاں جو زیادہ تر غیر ملکی ملکیت ہیں۔ ملک میں حقیقی پیداوار کو بڑھانے کی بجائے یا تو درآمد کی ہوئی دواؤں کو چھوٹی بوتلوں اور پڑیوں میں بند کرنے کا کام کرتی ہیں یا باہر سے منگوائے ہوئے خام مال اور فارمولوں کی بنیاد پر دوا سازی کرتی ہیں۔ ایسی صنعت کو صحیح معنوں میں صنعت تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان کی صنعت کا "پیکیجنگ اور اسمبلنگ" (Packaging and Assembling) کردار بنانے میں دواؤں کی کمپنیوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اور اس کام میں ان کی ہمت افزائی کرنے کے لیے انہیں باقاعدہ غیر ملکی امداد ملتی رہی ہے۔ پیکنگ کا سامان مہیا کرنے والی کمپنی پیکیجس لمیٹڈ کو بھی عالمی بینک کے ذیلی ادارے (I.F.C) آئی۔ ایف۔ سی کی طرف سے مالی امداد دی گئی ہے۔

(۳) اس گوشوارے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں اول تو صنعتی پیداوار کا بہت چھوٹا حصہ مشینری پر مشتمل ہے، اور دوسرے جو مشینری پیدا ہوتی ہے اس کا بڑا حصہ بجلی کی مشینری یعنی پنکھوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ذرائع پیداوار (Means of Production) کی پیداوار نہ ہونے کے برابر ہے۔

کسی ترقی پذیر ملک کی صنعتی پیداوار میں ذرائع پیداوار کا کم تناسب ہونا کسی حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس میں دن بہ دن خاطر خواہ ترقی ہوتی رہے۔ لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہوا۔ 55-1954 میں کل صنعتی پیداوار کا 79.7 فیصد اشیائے صرف (Consumption Goods) پر مشتمل تھا۔ اور پیداواری اشیاء (Investment goods) کا تناسب 8.9 فیصد تھا، لیکن 64-196ء تک اس تناسب میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ اشیاء صرف کا تناسب گھٹ کر 71.6 فیصد ہوگیا اور پیداواری اشیاء کا تناسب بڑھ کر 14.8 فیصد ہوگیا۔ (۸۳)

پاکستان میں بنیادی صنعت کی تقریباً غیر موجودگی کا ایک بڑا سبب غیر ملکی امداد ہے۔ سامراجی ملک امداد دینے کے ساتھ ایسی شرائط بھی عائد کرتے ہیں جن کی وجہ سے بنیادی صنعت کو فروغ دینا تقریباً ناممکن ہوجاتا ہے۔ پاکستان میں اسٹیل مل لگنے میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی اس کا سبب یہی ہے۔ امریکہ کی اسٹیل ملیں بیرونی منڈیوں میں دنیا کے دوسرے ملکوں کے اسٹیل کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ انہیں سہارا دینے کے لیے امریکی حکومت نے بہت سے پسماندہ ملکوں کو امداد دے

کر اپنے اسٹیل کے لیے منڈیاں پیدا کی ہیں۔ پاکستان بھی ان ملکوں میں سے ایک ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان میں اسٹیل مل کا قیام امریکی امداد کے اغراض و مقاصد کے خلاف جاتا ہے۔ اس لیے امریکی عملداروں اور مشیروں نے حکومت پاکستان پر مسلسل دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان میں اسٹیل نہ بنائیں۔ اس خودغرضی پر پردہ پوشی کرنے کے لیے پاکستان کی ''فوری ضروریات اور فوقیت'' کا سہارا لیا گیا اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے لیے اسٹیل میل یا دوسری کوئی بنیادی صنعت قائم کرنا محض ایک عزت اور وقار کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کی ترقی کے خلاف اس سازش میں وہ پاکستانی تاجر بھی شامل تھے جو امریکی اسٹیل درآمد کر کے کروڑوں کا منافع کمایا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسٹیل مل کی مخالفت میں سابق وزیر خزانہ امجد علی پیش پیش تھے۔ فینسی خاندان کی اسٹیل کارپوریشن کو عالمی بینک کے ادارے آئے۔ ایف۔ سی۔ کی طرف سے قرضے دیے گئے تاکہ وہ بیرونی اسٹیل درآمد کر کے محض ری رولنگ کرتے رہیں اور پاکستان کی صنعت کو سامراج کا محتاج بنائے رکھنے میں اپنا کردار انجام دیتے رہیں۔

صنعت کاروں کی نااہلیت:

سامراجی امداد سے پروان چڑھنے والی صنعت نہ فقط اپنی ترکیب کے لحاظ سے ملک کی ضروریات کے مطابق غیر موزوں ثابت ہوتی ہے، بلکہ وہ سرمایہ دارانہ اہلیت کے معیار پر بھی نہیں اُتر سکتی۔ پاکستان کی صنعتی پیداوار میں جو نام نہاد اضافہ ہوا ہے۔ وہ سرمایہ داروں کی حرمت کی وجہ سے نہیں بلکہ ٹیکس تعطیل (Tax holiday)، منافع پر ٹیکس کی کم شرح، ٹیکس میں کٹوتی (Rebate)، مشینوں کے گھسنے ٹوٹنے کے الاؤنس (Depreciation allowance)، درآمدی مال پر زیادہ ڈیوٹی کے ذریعہ تحفظ (Tariff Protection) سستے اور آسان زرمبادلہ، مزدوروں کی کم اجرتوں اور دیگر سرکاری مراعات کی وجہ سے ہوا ہے۔ (۸۴)

بقول ماہر معاشیات ڈاکٹر نورالاسلام (۸۵)، پاکستان کی مجموعی صنعتی پیداوار کی قدر میں ہونے والے اضافہ کا 96 فیصد درآمدات پر کنٹرول (Import Control) اور ان پر تحفظی ٹیکسوں (Tariff protection) کی وجہ سے ہوا ہے۔ اشیائے صرف کی صنعتوں میں موثر یا حقیقی تحفظ (Effective protection) کی شرح 117 فیصد تھی۔ نااہل صنعتوں میں سرفہرست جو صنعتیں

ہیں اور ان کو جو حفاظت دی گئی ہے ان کے نام اور حقیقی شرح حفاظت اس طرح سے ہیں:

شکر کی صنعت	283 فیصد	شرح حفاظت
بناسپتی گھی اور تیل	614 فیصد	// //
ریشم اور مصنوعی ریشم	119 فیصد	// //
ملبوسات	124 فیصد	// //
موٹر گاڑیوں کی صنعت	257 فیصد	// //
سوتی کپڑے کی صنعت	88 فیصد	// //
شکر کی صنعت	283 فیصد	// //

صنعتی نااہلیت کے اس پیمانے کو سمجھنے کے لیے آیئے ہم کپڑے کی صنعت کی مثال لیں۔ اگر کپڑے کے کارخانے کا مالک بیس روپیہ کی کپاس خریدتا ہے اور تیار کپڑے کو ایک سو بیس روپیہ میں فروخت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی عمل کی وجہ سے ایک سو روپیہ کی قدر کا اضافہ ہوا۔ لیکن مقامی منڈی میں اسے مختلف قسم کی حفاظتی مراعات حاصل ہیں، جیسے کہ غیر ملکی کپڑے کی درآمد پر بندش۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر وہ اس کپڑے کو عالمی منڈی میں فروخت کرے تو اسے کیا قیمت ملے گی۔ عالمی منڈی میں اسے فقط 32 روپیے ملتے ہیں جو کہ مقامی بازار میں کپڑے کی قیمت فروخت سے 88 روپیے کم ہیں۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقامی بازار کے بھاؤ کے حساب سے قدر میں جو ایک سو روپیے کا اضافہ ہوا اس پر کپڑے کی صنعت کو عالمی بازار کی قیمتوں کے مقابلہ میں 88 روپیے کی حفاظت ملی۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان کی کپڑے کی صنعت اس قدر نااہل ہے کہ اگر اسے برآمدی کپڑے کے مقابلہ میں ناجائز حفاظت نہ دی جائے تو اس کا کاروبار بند ہو جائے۔ یہی حال اکثر دوسری صنعتوں کا ہے (یہاں پر قدر اور قدر میں اضافہ کی تعریف سرمایہ دارانہ طریقے سے کی گئی ہے)

اوپر درج کی ہوئی نااہل صنعتوں میں سے شکر، گھی، تیل اور موٹر گاڑیاں بنانے والی صنعتوں کو بھاری مقدار میں غیر ملکی امداد ملتی رہی ہے۔

ٹیکسوں سے چھوٹ ملنے اور گھسنے اور ٹوٹنے کے الاؤنس کی وجہ سے سرمایہ دار جو فائدہ لیتے

ہیں اس کا بیان ایک اور ماہر معاشیات ڈاکٹر رب نے اس طرح سے کیا ہے:

"مستقل سرمائے کی لاگت (Fixed capital costs) کا 39 سے لے کر 46 فیصد تک پہلے ہی سال وصول ہوسکتا ہے۔ کل سرمایہ کاری کے اکثر اخراجات، یعنی 70 سے 89 فیصد تک، اور مشینوں کے اخراجات کا 78 سے 89 تک الاؤنسوں کے ذریعے پہلے پانچ سالوں میں وصول ہوجاتا ہے۔" (۸۶)

بیرونی مال کے مقابلے میں پاکستانی مصنوعات کی گراں قیمتوں کی وجہ سے محض نااہلی، ناجائز حفاظت اور سرکاری خیرات نہیں ہے، بلکہ جیسے اسیفن لوئز نے بتایا ہے:

"مزدوروں کی فی کس پیداوار (Labour Productivity) میں اضافہ ہوا لیکن مزدوروں کی حقیقی اجرتوں (Real wages) میں اضافہ نہیں ہوا۔" (۸۷)

درحقیقت قدر میں اضافے کا اصل سبب مزدور کی محنت ہے، اور جہاں کہیں بھی منافع خوری ہوتی ہے اس کی بنیاد مزدور کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ لیکن جدید نوآبادیاتی ملکوں کے گماشتہ سرمایہ دار براہ راست یا سیدھے طریقے سے مزدوروں کا استحصال کرنے کے علاوہ بالواسطہ یا دوسرے طریقوں سے، خاص طور پر سرکاری دولت پر ڈاکے ڈال کر، بھی بہت بڑے پیمانے پر منافع خوری کرتے ہیں۔

مچھلی بندر: سامراجی امداد کی ایک گھناؤنی مثال

سامراجی امداد کے ذریعہ لائی گئی اقتصادی ترقی کیا گل کھلاتی ہے اس کا اندازہ ہمیں کراچی کے مچھلی بندر کی مثال سے ہوسکتا ہے۔ 1955ء میں امریکہ نے کراچی میں مچھلی بندر تعمیر کرنے کے لیے 4 لاکھ 72 ہزار ڈالر کا عطیہ دیا۔ (۸۸) اس بندر پر مچھلی اتارنے کے لیے ایک جدید جیٹی، ایک برف خانہ، مچھلی کو حفاظت سے اسٹور کرنے کے لیے ایک سرد گودام، اور ماہی گیروں کی کوآپریٹو سوسائٹی، مچھلیوں کی تحقیق گاہ اور ریستوران کے لیے عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ جدید ٹرالر درآمد کیے گئے اور کچھ پرانی کشتیوں میں موٹر لگائے گئے۔ جدید قسم کے جال اور انکو بننے کا سامان باہر سے منگوایا گیا۔ نجی سرمایہ داروں نے مچھلی بندر پر مچھلی اور جھینگے کو جمانے کے لیے فریزنگ پلانٹ اور

ڈبوں میں پیک کرنے کے لیے کیننگ پلانٹ قائم کیے۔ اس طرح سے کم وبیش مقامی بازار کی ضروریات پر منحصر چھوٹے پیمانے کی ماہی گیری کو بہت جلد بڑی، جدید اور برآمدی صنعت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس تبدیلی نے چھوٹے اور غریب ماہی گیر کو تباہ کر دیا کیونکہ وہ جدید ٹرالوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ نئے ذرائع پیداوار، ی یعنی سرد خانوں اور ٹرالروں، کے مالک نہ فقط پچھلے مالکان ذرائع پیداوار سے زیادہ امیر اور اثر رسوخ رکھنے والے تھے بلکہ وہ مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ روایتی طور پر کراچی اور ساحل مکران کے مچھلی کے تاجر زیادہ تر اسماعیلی خوجہ اور بلوچ ہوا کرتے تھے اور ماہی گیر بلوچی، کچھی اور دوسرے سندھی ہوا کرتے تھے۔ مچھلی بندر کے قیام کے بعد ماہی گیروں کی لسانی ترکیب میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا، البتہ ماہی گیری کے ذرائع پیداوار اب زیادہ تر پنجابی، گجراتی اور اردو بولنے والے مہاجروں کے قبضے میں آ گئے۔ فینسی، ایچ غلام محمد، ریاض، خالد اور غنی جیسے سرمایہ دار اب مچھلی کے کاروبار میں کود پڑے۔

مچھلی بندر اور فشری کی نام نہاد ترقی سے پہلے بڑا تازہ جھینگا مقامی بازار میں آنے لگا۔ بڑے جھینگے کی قیمت ایکدم بڑھ کر چار ساڑھے چار روپیہ پاؤنڈ ہوگئی۔ موجودہ وقت پر کمپنیوں کا رد کیا ہوا کچرہ جھینگا کراچی میں آٹھ روپے سیر بکتا ہے اور عمدہ جھینگے کی قیمت 32 روپے فی سیر ہے۔ رفتہ رفتہ مچھلی کی مختلف قسمیں سرد خانوں میں پیک ہونے اور مقامی بازار سے غائب ہونے لگ گئیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ کراچی کے مقامی باشندے، جن کا ہر گھرانہ اپنی مرضی کی مچھلی یا جھینگا مناسب قیمت پر خرید کر کھا سکتا تھا، اب اپنی پسندیدہ اور روایتی خوراک کو ترستے ہیں۔ ساحل مکران کے ماہی گیری کے مراکز، پسنی، گودار اور اومازا کے ماہی گیروں کی پکڑی ہوئی مچھلی بھی یا تو کراچی کے سرد خانوں کو بھجوا دی جاتی ہے یا بیچ سمندر میں ایرانی تاجروں کو فروخت کر دی جاتی ہے۔ ان دونوں اسباب کی وجہ سے ساحل مکران پر جھینگا اور مچھلی یا تو بالکل دستیاب نہیں ہوتے یا ان کی قیمتیں اتنی گراں ہوگئی ہیں کہ ایک عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہیں۔

مقامی آبادی کو لحمیات (Proteins) سے بھرپور روایتی غذا سے محروم کرنے کو اس ملک میں ترقی اور زرمبادلہ کمانے کے نام پر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم خالص سرمایہ دارانہ معاشی نقطہ نظر سے بھی اس مسئلہ کی چھان بین کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جھینگا اور مچھلی کی برآمد سے ملک کو نفع نہیں بلکہ شدید نقصان ہوا ہے، اور فائدہ صرف سامراجی ملکوں اور مقامی گماشتہ

سرمایہ داروں کو ہوا ہے۔

پاکستان کا جھینگا اور مچھلی زیادہ تر جاپان اور امریکہ کو برآمد ہوتا ہے۔ جھینگا تقریباً سب کا سب برف میں جما کر باہر بھیجا جاتا ہے۔ جماتے وقت جھینگے کا سر اور چھلکا نکال دینے کی وجہ سے وزن آدھے سے بھی کم ہو جاتا ہے۔ 1955ء سے لے کر 1961ء تک پاکستان نے 57 لاکھ 62 ہزار پاؤنڈ ایسے جمے ہوئے جھینگے درآمد کیے، لیکن اسے اسکی اوسط قیمت پونے تین روپے فی پاؤنڈ ملی (۸۹)، جبکہ کراچی کے بازار میں سر اور چھلکے سمیت تازہ جھینگے کی قیمت چار ساڑھے چار روپے پاؤنڈ تھی۔ اگر اس میں فیکٹری کا خرچ اور مزدوروں کی اجرت بھی شامل کر دی جائے تو ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جھینگے کی برآمد میں پاکستان کو کتنا نقصان ہوا۔ لیکن سرد خانوں یا مچھلی کے کارخانوں کے مالک ظاہر ہے کہ نقصان والا دھندہ نہیں کریں گے۔ وہ ملک کی دولت اس طرح سے فقط اس لیے لٹا سکتے تھے کہ سابق وزیر خارجہ محمد شعیب کی بونس اسکیم کے تحت جھینگے برآمد کرنے والوں کو کمائے ہوئے زرمبادلہ پر ۴۰ فیصد بونس واؤچر دیے جاتے تھے۔ ان بونس واؤچروں سے یا تو وہ کوئی چیز درآمد کر کے مقامی بازار میں بیچ سکتے تھے یا ان کو 190 فیصد تک منافع پر درآمد کرنے والے تاجروں کے ہاتھ بیچ سکتے تھے۔ یہ بونس واؤچر کا طریقہ کار کچھ اس طرح سے کام کرتا تھا: اگر کسی مچھلی کے تاجر نے 100 ڈالر کا جھینگا برآمد کیا تو اسٹیٹ بینک اسے اس 100 ڈالر کی جگہ سرکاری نرخ کے مطابق 475 روپے دینے کے علاوہ 40 ڈالر کے واؤچر دے دیتی تھی۔ یہ واؤچر جب وہ بازار میں فروخت کرتا تھا تو اسے اس وقت کے بھاؤ کے مطابق قیمت ملتی تھی۔ اگر بازار کا بھاؤ 190 فیصد ہوتا تھا تو اسے ان واؤچروں کے عیوض 361 روپیہ مل جاتے۔ اس طرح سے اسے 100 ڈالر کی برآمد کے عیوض 836 روپے مل جایا کرتے تھے۔ اس طرح سے پونے تین روپیہ فی پاؤنڈ باہر برآمد کیے ہوئے جھینگے کے لیے اسے درحقیقت پونے پانچ، پانچ روپے فی پاؤنڈ مل جایا کرتے تھے۔ لیکن اکثر سرد خانوں کے مالک اپنے واؤچر بازار میں نہیں بیچا کرتے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ میں درآمدی تاجر بھی تھے۔ جو اونچے طبقوں کے لیے اشیاء تعیش درآمد کر کے بھاری نفع کمایا کرتے تھے۔ ایسی اشیاء تعیش کے لیے کراچی کی زیب النسا اسٹریٹ پر جھینگا مچھلی برآمد کرنے والے ایچ غلام محمد کی دوکان کافی مشہور ہے۔

جہاں تک فشری کے مالکان کی اپنی زرمبادلہ کی ضروریات کا تعلق ہے، وہ انہیں حکومت کی

طرف سے سرکاری نرخ پر مہیا کی جاتی تھیں۔ فشری میں اندھی کمائی دیکھ کر بیسیوں سرمایہ داروں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سرد خانے لگانے کے لیے لائسنس حاصل کر لیے۔ 1963ء میں کراچی میں 13 فریزنگ اور کیننگ پلانٹ تھے، لیکن خام مال کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی پیداواری گنجائش کی آدھی پیداوار بمشکل کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود بھی حکومت نے 11 مزید کارخانے لگانے کے لیے لائسنس جاری کر دیے۔ 1968ء تک فریزنگ پلانٹ (سرد خانوں) کی تعداد بڑھ کر 18 ہوگئی اور کیننگ پلانٹ کی تعداد 4 ہوگئی۔ اس وقت کراچی میں 10 فریزنگ پلانٹ اور 12 کیننگ پلانٹ کام کر رہے ہیں۔ ان کارخانوں کو مچھلی اور جھینگا پہنچانے کے لئے کراچی کے ساحل کے قریب جس بیدردی سے مچھلی ماری جا رہی ہے اس کے نتیجے میں یہاں کے سمندری ذرائع کو نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ فیکٹری کے مالکوں کی ہوس کی وجہ سے اکثر مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مالکان کئی کئی روز تک جھینگا نہیں اٹھاتے اور ماہی گیر بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر سستے داموں پر مال دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اب بونس واؤچر اسکیم ختم ہوگئی ہے لیکن پاکستانی روپے کے نرخ میں سو فیصد سے زیادہ کمی ہو جانے کی وجہ سے جھینگا اور مچھلی برآمد کرنے والے سرمایہ داروں کے لیے اب بھی ممکن ہے کہ وہ مقامی لوگوں کو مچھلی سے محروم کر کے سامراجی ملکوں کو یہ غذا پانی کے مول فروخت کریں۔ امریکی تاجر جس وقت پاکستانی جھینگا دو یا تین روپیہ فی پاؤنڈ کے حساب سے خریدا کرتے تھے اس وقت امریکی سپر مارکیٹوں میں جھینگے کی قیمت ڈھائی تین ڈالر یعنی ساڑھے بارہ سے پندرہ فی پاؤنڈ تھے۔ پھر بھی امریکہ کے معیار زندگی کے لحاظ سے یہ مناسب قیمت تھی۔ جاپان میں ایک طرف غذائی اشیاء کی عام کمی ہے تو دوسری طرف جاپان میں سمندری مچھلیوں اور جھینگوں وغیرہ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ پاکستان اور دوسرے ملکوں سے جھینگے اور مچھلی درآمد کر کے جاپان معقول قیمتوں پر اپنی ضروریات پوری کرتا ہے۔

پاکستان میں سرمایہ دارانہ سوچ رکھنے والوں کی نظر میں مچھلی بندر امریکی امداد کی ایک مثبت مثال ہے۔ ہم نے اپنے تجزیے سے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس ''مثبت'' مثال کا پاکستان کی معیشت پر، ماہی گیروں پر اور ساحل کی مقامی آبادی پر کیا اثر پڑا۔ اگر ''مثبت'' کا یہ حال ہے تو پھر امریکی امداد سے کی گئی دوسری ''ترقی'' کی کیا نوعیت ہوگی؟

زراعت میں جمود اور سبز انقلاب

زمیندار اور جاگیردار طبقہ کے مفادات نوآبادیاتی دور میں سامراجیوں کے ساتھ منسلک تھے لیکن آزادی کے بعد جدید نوآبادیاتی تسلط قائم ہونے کے ساتھ ساتھ گماشتہ صنعت کار اور تاجر نے زور پکڑا۔ زمینداروں کو ایک طرف تو حقیقی زرعی اصلاحات سے تحفظ دیا گیا اور صنعت کاری کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے، اور دوسری طرف ملک کی اقتصادی پالیسیاں ایسی بنائی گئیں جن سے صنعتی شعبہ کو زراعت کے مقابلہ میں ناجائز ترجیح دی گئی۔ زرمبادلہ کی غیر ہموار شرح، درآمدات پر کنٹرول (Imports controls) اور زرعی اشیاء پر برآمدی ڈیوٹی (Export duty) کی وجہ سے زرعی آمدنی کا ایک کثیر حصہ صنعتی شعبہ میں منتقل کر دیا گیا۔ پاکستان میں زرعی اشیاء کی قیمتوں کو مصنوعات کے مقابلہ میں زبردستی کم رکھا گیا تاکہ سرمایہ داروں کو خام مال کم قیمتوں پر ملے اور کھانے پینے کی اشیاء کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے مزدوروں کو کم اجرت دینی پڑے۔ قیمتوں میں اس ہیرا پھیری کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ اگر پاکستان میں زرعی اشیاء اور صنعتی پیداوار دونوں کو عالمی منڈی کی قیمتوں کے حساب سے فروخت کیا جاتا تو زرعی اشیاء کو زیادہ اور مصنوعات کو کم قیمت وصول ہوتی۔ 1950ء کی دہائی کی شروعات میں زرعی اشیاء کو مصنوعات کے مقابلے میں جو قیمتیں حاصل ہونی چاہیے تھیں ان کا فقط 40 فیصد حاصل ہوا اور 1960ء کی دہائی کی شروعات میں 62 فیصد حاصل ہوا (۹۰)۔ نسبتی قیمتوں کے اس پیمانے کو نسبی شرائط تجارت (Relative terms of trade) کہا جاتا ہے اور اس سے کسانوں کی مسلسل بدحالی کا حساب لگایا جاسکتا ہے۔ زرعی اشیاء کی قیمتوں کا اثر زمیندار پر بھی پڑتا ہے لیکن وہ کسان کی لوٹ کھسوٹ اور شدید کر کے پورے کا پورا بوجھ اسی پر ڈال دیتا ہے۔

غیر ملکی امداد کی وجہ سے پاکستان میں ایک طرف تو اس قسم کی اقتصادی منصوبہ بندی کی گئی جس سے زراعت میں جمود چھا جائے تو دوسری طرف اس صورت حال کا سامنا کرنے کے بہانے امریکہ کی فالتو گندم بطور امداد دے کر عوام پر احسان جمایا جاتا رہا ہے۔

دنیا بھر میں غذا کی صورت حال جب ایک نازک موڑ پر پہنچ گئی تو سامراجیوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ امریکہ کی فاضل زرعی پیداوار سے دنیا کا پیٹ نہیں بھرا جاسکتا ہے اور یہ کہ اگر تیسری

دنیا کے غریب عوام شدید قحط کا شکار ہو گئے تو دنیا کے 'امن واستحکام' میں کہیں خلل نہ پیدا ہو جائے اور وہ سرخ انقلاب کی طرف نہ راغب ہو جائیں۔ اس خطرے کا سامنا کرنے کے لیے سامراجیوں نے ایک ایسی ترکیب سوچی جس سے نیم غلام ملکوں کے سماجی رشتوں اور سیاسی اقتدار میں کوئی فرق نہ آئے اور ساتھ ساتھ خوراک کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہو جائے۔ اس منصوبے کو انہوں نے ''سبز انقلاب'' کا نام دیا۔ ''سبز انقلاب'' کا مقصد ٹریکٹروں، ٹیوب ویلوں، کیمیائی کھاد، نئے بیجوں، کیڑا مار دواؤں اور دوسرے تکنیکی اقدامات کے ذریعے موجودہ سماجی نظام میں زرعی پیداوار کو بڑھانا تھا۔ یہ ''انقلاب'' 1965ء کے لگ بھگ پاکستان میں بھی شروع ہو گیا۔ جہاں تک ٹریکٹروں اور ٹیوب ویلوں کا سوال ہے تو 1968ء میں خود حکومت پاکستان کی طرف سے لیے ہوئے جائزے (۹۱) سے معلوم ہوا کہ یہ زیادہ تر بڑے اور درمیانے زمینداروں کو نصیب ہوئے (گوشوارہ ۵)۔ کل ٹریکٹروں میں سے 53 فیصد سوا ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین کے مالکوں کے حصہ میں آئے اور 35 فیصد 26 سے 100 ایکڑ کے مالکوں کو فروخت کیے گئے۔ ان ٹریکٹروں کی وجہ سے اب تک ہزاروں کسانوں کی بے دخلی ہو چکی ہے۔ ایک سرکاری ماہر معاشیات کا کہنا ہے کہ 1985ء تک چھ سے سات لاکھ تک کسان بے دخل ہو جائیں گے۔ (۹۲)

گوشوارہ نمبر ۵

ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کی تقسیم ملکیت اراضی کے حساب سے 1968

ملکیت اراضی	ٹریکٹر		ٹیوب ویل	
ایکڑ	تعداد	فیصد	تعداد	فیصد
غیر زمیندار	574	3	4680	7
13 سے کم	450	3	3320	4
13 سے 25	1025	6	15240	20
26 سے 50	2326	14	18050	24
51 سے 100	3407	21	14240	19

12	9120	19	3094	101 سے 200
7	5550	19	3238	201 سے 500
7	5520	15	2469	500 سے زیادہ
100	75720	100	16583	کل

Source: Farm Mechaniation in West Pakistan, Report of the Farm Mechanization Committee, March 1970

چونکہ زیادہ تر بڑے زمینداروں کو حسب ضرورت نہری پانی مل جاتا ہے، لہٰذا ٹیوب ویلوں کا بیشتر حصہ درمیانہ اور چھوٹے زمینداروں نے لگایا۔ اس وقت حکومت ہر ٹیوب ویل پر چار ہزار سے لے کر بارہ ہزار روپے کی رعایت دیتی ہے اور کیمیاوی کھاد کی قیمت کم رکھنے کے لیے سالانہ 60 کروڑ روپے خرچ کر رہی ہے (۹۳)۔ اس رعایت سے زیادہ تر فائدہ بڑے اور درمیانے زمینداروں کو ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو زرعی قرضے دیے جاتے رہے ہیں۔ 75-1974ء میں ان قرضوں کی مجموعی رقم 104 کروڑ روپیہ تھی جس کا بیشتر حصہ زرعی ترقیاتی بینک کی طرف سے دیا گیا (۹۴)۔ ان قرضوں سے زیادہ تر فائدہ بڑے اور درمیانے زمیندار لیتے رہے ہیں (۹۵)۔

ایک طبقاتی معاشرے کے معیار کے لحاظ سے پاکستان کا ''سبز انقلاب'' کافی کامیاب رہا۔ 1968ء تک پاکستان میں 16,583 نجی ٹریکٹر کام کر رہے تھے اور 1971ء کی آخر تک 15,000 مزید ٹریکٹر درآمد کرنے کا خیال تھا (۹۶)۔ لیکن بنگلہ دیش کے تنازعہ اور اقتصادی بحران کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی حکومت نے ٹریکٹروں کی درآمد پر بندش عائد کر دی۔ 74-1973ء میں 7000 ٹریکٹر درآمد کیے گئے (۹۷)۔ جبکہ 75-1974ء میں درآمد کیے گئے ٹریکٹروں کی تعداد 7000 سے اوپر تھی (۹۸)۔ اس سال مزید 15000 ٹریکر منگوانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ 1968ء تک پاکستان میں 75,720 نجی اور 7982 سرکاری ٹیوب ویل لگے ہوئے تھے (۹۹)۔ لیکن 76-1975 تک نجی ٹیوب ویلوں کی تعداد بڑھ کر ایک لاکھ 26 ہزار ہو گئی اور حکومت کی طرف سے ہر سال سات آٹھ ہزار ٹیوب ویل لگائے جا رہے ہیں (۱۰۰)۔ نئے بیجوں کا استعمال اتنا عام ہو گیا ہے کہ 73-1972ء تک گندم کا 56 فیصد رقبہ، چاول کا 44 فیصد اور مکئی کا 25 فیصد زیر کاشت

رقبہ نئے بیجوں سے بویا جا رہا تھا (۱۰۱)۔ کیمیائی کھاد کا استعمال 61-1960ء میں فقط 31 ہزار ٹن تھا، لیکن 75-1974ء میں یہ بڑھ کر سوا چار لاکھ ٹن ہو گیا (۱۰۲)۔ کیڑا مار دواؤں کے استعمال میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ ''سبز انقلاب'' کی تدابیر کی بدولت ابتدائی سالوں میں زرعی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ 66-1965ء میں گندم کی اوسط فی ایکڑ پیداوار 9 من سے بھی کم تھی، لیکن 73-1972ء تک یہ بڑھ کر ساڑھے تیرہ من سے بھی کم تھی، لیکن 73-1972 تک یہ بڑھ کر ساڑھے تیرہ من ہو گئی۔ چاول کی فی ایکڑ پیداوار ساڑھے دس من سے بڑھ کر سترہ من ہو گئی اور کپاس کی 2.9 من سے بڑھ کر 3.8 من ہو گئی (۱۰۳)۔ لیکن اب ''سبز انقلاب'' اپنے عروج کو پہنچ چکا ہے، اور تمام تدابیر کے باوجود فی ایکڑ پیداوار کمی بیشی تو ہوتی رہتی ہے لیکن مجموعی طور پر اب زیادہ اضافے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔

''سبز انقلاب'' نے ایک طرف سماجی، طبقاتی اور صوبائی تفریق بڑھا دی ہے تو دوسری طرف اس سے پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا فائدہ کسانوں اور شہری غریبوں کو کم اور زمینداروں اور تاجروں کو زیادہ ہوا ہے۔ دوسری سامراجی ترکیبوں کی طرح ''سبز انقلاب'' بھی ملک کی پسماندگی اور محتاجی میں اضافہ کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔

گماشتوں کا جال:

پاکستان میں گماشتہ سرمایہ داری کو فروغ دینے کے لیے سامراجیوں کی طرف سے جو ادارے قائم کیے گئے ہیں ان کا ذکر ہم تیسرے باب میں کر چکے ہیں۔ ہم نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان کی معیشت کو اپنے تابع رکھنے کے لیے امریکی سامراجیوں نے کس طرح پاکستان کی منصوبہ بندی پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان کو غیر ملکی امداد کا محتاج بنا کر سامراجیوں کی طرف سے عائد کی ہوئی ملک کے لیے نقصان دہ شرائط کا پابند بنایا گیا۔ ان باتوں اور دوسرے سامراجی ہتھکنڈوں کی وجہ سے ملک کی معیشت مجموعی طور پر سامراجیوں کی عالمی منڈی میں دن بہ دن بری طرح پھنستی گئی، لیکن سامراجیوں نے اپنی کوششوں سے نہ فقط یہاں کے گماشتوں کے ساتھ اپنے رشتے مستحکم کیے بلکہ ان کے مختلف طبقات کی آپس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اگر سرمایہ دار طبقے پر نظر ڈالی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا بڑا

سرمایہ دار ہو جس کو غیر ملکی سرکاری یا نجی امداد نہ ملی ہو۔ بینک اور صنعتی بینک کی طرف سے جن کمپنیوں کو غیر ملکی سرکاری امداد ملی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱۰۴):

سرحد (کالونی) ٹیکسٹائل ملز	خیبر تمباکو کمپنی
حبیب شوگر ملز	فوجی شوگر ملز
ولیکا کیمیکل انڈسٹریز	انٹر کانٹینینٹل ہوٹل
آدم جی انڈسٹریز	کرنافلی پیپر مل
کوہ نور ریان ملز	کریسنٹ جوٹ ملز
زیل پاک سیمنٹ فیکری	اسماعیل سیمنٹ
حسین شوگر ملز	پیکیجز لمیٹڈ
کریسنٹ شوگر ملز	پاک پیپر کارپوریشن
فرنٹیئر شوگر ملز	اسٹیل کارپوریشن
حبئ سنز شوگر ملز	جوہر آباد شوگر ملز
پلاسٹیکو	لیہ شوگر ملز
پریمئر شوگر ملز	پہاڑ تلی ٹیکسٹائل ملز
	کرنافلی ریان ملز

جن کمپنیوں کو غیر ملکی نجی امداد ملی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱۰۵):

حبئ سنز شوگر ملز

باوانی شوگر ملز

حبیب شوگر ملز

ولیکا کیمیکل انڈسٹریز

سوئی گیس

پاکستان ریفائنری لمیٹڈ

اس کے علاوہ بہت سے پاکستانی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر غیر ملکی سرمایہ داروں نے مشترکہ سرمایہ کاری کی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کا ذکر ہم آئندہ باب میں کریں گے۔

''سبز انقلاب'' کے ذریعے بین الاقوامی سامراجی کمپنیوں، پاکستان کے گماشتہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کے درمیان باہمی انحصار اور یکجہتی کو مزید مضبوط کیا گیا اور سامراج کے محتاج گماشتوں کا جال اور بھی وسیع کر دیا گیا۔ ''سبز انقلاب'' کے بہانے سامراجیوں اور ان کے گماشتوں کا جال اس طرح سے کام کرتا ہے: سامراجی کمپنیاں میسی فرگوسن، انٹرنیشنل ہارویسٹر، فورڈ، جان ڈیئر، اور کلوخر ہولڈ ڈوٹز، پاکستان کو ٹریکٹر یا ان کے کل پرزے برآمد کرتی ہیں۔ آدم جی، رانا، شاہنواز، وزیر علی، گیلانی، اور سردار غضنفر اللہ درآمد شدہ پرزوں سے ٹریکٹر اسمبل کرتے تھے، اور ہزاروں زمیندار انہیں خرید کر استعمال کرتے تھے یا کرتے ہیں۔ اس طرح داؤد نے ہر کولیس کے ساتھ مل کر کیمیائی کھاد کی فیکٹری لگائی اور بیرونی کمپنی ایسو نے ڈھرکی میں اپنی کیمیائی کھاد کی فیکٹری قائم کی غیر ملکی کمپنیاں ایسو، برماشیل اور کالٹیکس، ٹریکٹروں اور ٹیوب ویلوں کے لیے ڈیزل مہیا کرتی ہیں۔ امریکہ کے دو بڑے سرمایہ داروں کے 'خیراتی' ادارے فورڈ فاؤنڈیشن اور راکیفیلر فاؤنڈیشن دنیا بھر میں 'سبز انقلاب' کے لیے تکنیکی امداد مہیا کرتی ہیں اور امریکی حکومت قرضے مہیا کرتی ہے۔ ان رشتوں کی وجہ سے پاکستان کی معیشت سامراجیوں کی مزید محتاج ہوگئی ہے اور اپنے گماشتوں کے ذریعے سامراج کے پنجے اور زیادہ مضبوطی سے گڑ گئے ہیں۔ اس عمل میں بیرونی امداد کا بہت بڑا دخل ہے۔

پانچواں باب

غیر ملکی سرمایہ کاری

''ہماری خارجہ پالیسی کا ایک سنجیدہ اور واضح مقصد، بیرونی ممالک میں سرمایہ لگانے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا ہے۔'' امریکی صدر آئزن ہاور، 1953ء میں قوم سے خطاب

''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ پاکستان جائیں۔ یہ پیسہ بنانے کے لیے اچھی جگہ ہے۔'' امریکی سرمایہ دار چارلس بیزول، امریکی تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے۔

چونکہ پاکستان میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری اب تک بہت بڑے پیمانے پر نہیں ہوئی ہے اس لیے سامراج کا تجزیہ کرتے وقت اکثر لوگ سامراجی لوٹ کھسوٹ کے اس پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لیکن گہری چھان بین کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بیرونی سرمایہ کی لاگت کم ہونے کے باوجود بھی اس سے بہت زیادہ منافع کمایا جا رہا ہے اور یہ سرمایہ کاری ملک کی ترقی کے لیے مُضر ثابت ہوئی ہے۔

یوں تو غیر ملکی سرمایہ کاری انگریزوں کے زمانے سے ہوتی چلی آ رہی ہے، لیکن امریکی امداد کی وجہ سے سامراجی سرمایہ داروں کو پاکستان کی معیشت کے اہم شعبوں پر قبضہ جمانے اور گماشتے پیدا کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ پاکستان کی پیداواری قوتوں کو آزاد ہونے سے روکنے میں اور ملک کی پسماندگی کو برقرار رکھنے میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کے لیے سازگار ماحول

سامراجی ذریعوں سے ملنے والی امداد کی شرائط میں اکثر یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ امداد دینے والا ملک غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرے اور اس کو تحفظ دے۔ امریکہ اور عالمی بینک کی طرف سے دی جانے والی امداد کے ساتھ اس قسم کی شرائط بہت واضح طور پر بیان کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ کے بیرونی امداد کے ایکٹ مجریہ 1969ء کے اصولوں کی دفعہ 102(e) میں کہا گیا ہے کہ ''صدر (امداد حاصل کرنے والے ملکوں میں) امریکہ کے نجی ذرائع کی ہمت افزائی کریں گے'' (۱۰۶)۔ اس طرح عالمی بینک کے سمجھوتے کی دفعات میں یہ بات شامل ہے کہ بینک، امداد حاصل کرنے والے ملکوں میں غیر ملکی نجی سرمایہ کاری کی حمایت کرے گا۔ عالمی بینک نے اپنے پالیسی دستاویز نمبر 204 کے تحت کئی ملکوں پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں متعدد ملکوں کو بینک نے اپنی طرف سے ''سزا'' بھی دی ہے۔ (۱۰۷)

پاکستان چونکہ امریکہ، عالمی بینک اور دوسرے سامراجی ملکوں سے بھاری امدادی رقم حاصل کرتا رہا ہے لہٰذا پاکستان بھی ان کی شرائط کا پابند ہے۔ پاکستان نے غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے لیے بیرونی امداد کے ذریعہ جو ادارے قائم کیے ہیں ان کا ذکر ہم تیسرے باب میں کر چکے ہیں۔ ان اداروں میں پکک اور آئے۔ اے سی۔ پی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پاکستان کی گماشتہ سرمایہ داری کے تقاضوں کے تحت حکومت نے ایسی پالیسیاں مرتب کی ہیں اور ایسی مراعات پیش کی ہیں جن سے غیر ملکی سرمایہ داروں کو اپنی کارگزاری میں مدد ملے۔ غیر ملکی سرمایہ داروں کو پہلے سے ہی بہت فراخدلانہ مراعات دی ہوئی تھیں، لیکن حال میں حکومت پاکستان نے ان مراعات میں مزید توسیع کر دی ہے (۱۰۸)۔ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کو جو سہولتیں مہیا ہیں ان میں سے چند اہم سہولتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) غیر ملکی سرمایہ داروں کو حق ہے کہ وہ پاکستان میں لگائے ہوئے اپنے سرمایہ کی پوری رقم اپنے ملک کے زرمبادلہ میں یہاں سے واپس لے جائیں۔

(۲) غیر ملکی سرمایہ دار اپنے سرمایہ پر کمائے ہوئے منافع کو پاکستان سے باہر لے جا سکتے ہیں۔

(۳) پاکستان میں کمائے ہوئے منافع کی دوبارہ سرمایہ کاری کرنے سے یا سرمایہ کی قدر میں اضافہ ہوجانے کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ داروں کو جو منافع ہوتا ہے اسے بھی انہیں پاکستان سے باہر بھیجنے کا حق ہے۔

(۴) غیر ملکی مشیروں اور ملازموں کو حق ہے کہ وہ اپنی تنخواہ کا ایک حصہ اپنے وطن ارسال کریں۔

(۵) جو غیر ملکی سرمایہ دار اور ملازم اپنے ملکوں میں ٹیکس ادا کر رہے ہیں انہیں پاکستان میں دوبارہ ٹیکس ادا کرنا واجب نہیں ہے۔

(۶) غیر ملکی سرمایہ داروں کو ٹیکس کی وہ تمام رعایتیں مہیا کی جائیں گی جو مقامی سرمایہ داروں کو حاصل ہیں۔

(۷) اس کے علاوہ غیر ملکی سرمایہ داروں کو ٹیکس کی خاص مراعات حاصل ہوں گی۔

(۸) درآمد اور برآمد کے قوانین غیر ملکی اور پاکستانی سرمایہ داروں کے لیے یکساں طور پر لاگو کیے جائیں گے۔

(۹) امریکی سرمایہ داروں کو ضمانت دی گئی ہے کہ زرمبادلہ کو ڈالروں میں منتقل کرتے وقت انہیں کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا

(۱۰) غیر ملکی صنعتوں کو عام طور پر قومی تحویل میں نہیں لیا جائے گا۔ اگر پاکستان کے عظیم تر مفاد میں انہیں قومی تحویل میں لینے کی ضرورت پڑی تو یہ عمل قانون کی رو کے مطابق کیا جائے گا اور غیر ملکی سرمایہ داروں کو ان کے اپنے ملک کی کرنسی میں معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

غیر ملکی سرمایہ کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتے ہوئے چند سال قبل جب زندگی کے بیمہ کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اس وقت پاکستانی کمپنیوں کو کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا لیکن غیر ملکی کمپنیوں کو معاوضہ ادا کیا گیا اسی طرح جب پاکستانی بینکوں کو قومی تحویل میں لیا گیا تو اس وقت غیر ملکی بینکوں کو اس قانون سے مستثنیٰ کیا گیا۔

غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے لیے نہ فقط اوپر درج کیے ہوئے مراعات دیے گئے ہیں اور ایسے ادارے قائم کیے گئے ہیں جن سے غیر ملکی سرمایہ کاری کو مدد ملے، بلکہ سامراجی ملکوں کی حکومتوں کی طرف سے ان سرمایہ داروں کو امدادی رقم بھی دی جاتی ہے تاکہ انہیں پاکستان میں قدم جمانے میں آسانی ہو۔ حکومت امریکہ نے پاکستان میں امریکی سرمایہ [illegible] ایک

خاص فنڈ کھول رکھا ہے جسے کولی فنڈز (Cooley Funds) کہا جاتا ہے۔ یہ فنڈ ان روپیوں سے فراہم کیا جاتا ہے جو امریکہ نے فاضل زرعی اشیا کے عوض حکومت پاکستان سے لے کر ایک خاص اکاؤنٹ میں جمع کروائے ہوئے ہیں۔ 1968ء تک اس فنڈ سے 69 کروڑ روپیہ کے 26 قرضے مختلف امریکی کمپنیوں کو دیے گئے تاکہ وہ، پاکستانی سرمایہ داروں کے ساتھ مل کر مشترکہ سرمایہ کاری کریں (۱۰۹)۔ اس طرح سے روپیوں میں امریکی گندم خریدنے کی اسکیم جس کا مطلب پاکستان کا زرمبادلہ بچانا تھا اب روپیوں کو ڈالروں میں منتقل کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ امریکی کمپنیاں کولی فنڈز سے پاکستانی روپیوں میں قرضہ لے کر پاکستان میں اپنے کاروبار میں لگاتی ہیں، لیکن اس سے انہیں جو منافع ہوتا ہے وہ غیر ملکی سرمایہ کاری کے قوانین کے تحت ڈالروں میں پاکستان سے باہر بھیجا جاسکتا ہے۔ ان پالیسیوں کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کو امریکی امداد ملنے سے پہلے پاکستان میں امریکی نجی سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اس کا تناسب تیزی سے بڑھتا گیا اور پاکستان میں مجموعی غیر ملکی نجی سرمایہ کے تقریباً ایک چوتھائی کو پہنچ گیا (۱۱۰)۔

غیر ملکی سرمایہ کا بہاؤ:

یہ بات اب تک واضح نہیں ہے کہ پاکستان میں کل کتنا غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا ہے اور پاکستان کی معیشت کا کتنا حصہ غیر ملکی نجی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں ہے۔ غیر سرکاری اندازوں کے مطابق اس وقت ملک میں ڈیڑھ ارب سے دو ارب روپیہ تک کا غیر ملکی نجی سرمایہ لگا ہوا ہے۔ 1970ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر ملکی نجی ذریعوں کا پاکستان پر 359 کروڑ روپیہ کا 'قرضہ' تھا (۱۱۱)۔ یہ "قرضہ" زیادہ تر غیر ملکی سرمایہ کی صورت میں تھا، جبکہ ایک چوتھائی رقم غیر ملکی نجوں ذریعوں سے لیے ہوئے حقیقی قرضے کی صورت میں تھی۔ اس رقم میں برطانوی سرمایہ کا تناسب 35.1 فیصد تھا اور امریکی سرمایہ کا تناسب 16 فیصد تھا۔ امریکی سرمائے کا تناسب کم ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ امریکی سرمایہ داروں نے برطانوی سرمایہ داروں کے مقابلے میں بہت دیر بعد پاکستان میں سرمایہ لگانا شروع کیا تھا اور 1959ء تک امریکی سرمائے کا تناسب فقط 7.7 فیصد تھا جبکہ برطانوی سرمائے کا حصہ 46.5 فیصد تھا۔ نئے لگنے والے سرمائے میں امریکی سرمائے

کا تناسب ایک تہائی سے لے کر نصف تک اور برطانوی سرمائے کا تناسب ایک چوتھائی یا 25 فیصد کے لگ بھگ تھا (۱۱۲)۔

1970ء تک پاکستان میں 183 غیر ملکی کمپنیوں کی شاخیں تھیں، 477 جائنٹ اسٹاک کمپنیوں میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا تھا جو نجی شراکت داری کے طور پر کھولی گئی تھیں (۱۱۳)۔

غیر ملکی سرمایہ زیادہ تر صنعت کاری کے شعبے میں لگا ہوا ہے۔ 1970ء میں نئے لگنے والے غیر ملکی سرمائے کا 71 فیصد صنعت میں لگایا گا تھا (۱۱۴)۔ امریکی ماہر معاشیات اسٹیون لوئیز کے تخمینہ کے مطابق 1960ء کی دہائی کے وسط میں پاکستانی صنعتوں کے مستقل اثاثوں (Fixed Investment) کا 10 فیصد سے بھی کم حصہ غیر ملکی تحویل میں تھا (۱۱۵)۔ لیکن ایک پاکستانی ماہر معاشیات امجد چودھری نے حساب لگایا ہے کہ 1962ء میں پاکستانی صنعتوں میں لگے ہوئے مالکی سرمائے (Equity) اور زیر استعمال سرمائے (Employed capital) کا 30 فیصد غیر ملکی تھا۔ 1967 تک صنعتی پونجی میں غیر ملکی سرمائے کا تناسب گھٹ کر 15 فیصد ہو گیا اور زیر استعمال سرمائے میں غیر ملکی حصہ 17.5 فیصد رہ گیا (۱۱۶)۔ صنعتی سرمائے میں غیر ملکی حصہ کی کمی کا ایک اہم سبب 1965ء کی جنگ تھی جس کی وجہ سے بیرونی ملکوں سے آنے والے نئے سرمائے کا بہاؤ (Inflow) تقریباً بند ہو گیا تھا۔ 1968ء میں نئے غیر ملکی سرمائے کی درآمد میں کچھ اضافہ ہوا، لیکن ایوب خان کی حکومت کا تختہ الٹنے اور پاکستان کے مسلسل سیاسی بحران کی وجہ سے غیر ملکی سرمائے کی درآمد میں پھر کمی ہو گئی۔ سیاسی استحکام بحال ہونے کے بعد غیر ملکی سرمایہ داروں کی دوبارہ ہمت افزائی ہوئی ہے، اور ہوٹلوں اور دوسرے کاروبار میں پھر غیر ملکی سرمایہ کاری شروع ہو گئی ہے۔

غیر ملکی سرمایہ کاری کے حق میں جو دلائل دیے جاتے ہیں ان میں سے ایک بھاری دلیل یہ ہے کہ یہ سرمایہ پسماندہ یا ترقی پذیر ملکوں میں سرمائے کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ اگر ہم پاکستان میں لگنے والے نئے غیر ملکی سرمایہ (Inflows) کا تجزیہ کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ ''نیا'' سرمایہ سب کا سب نیا نہیں ہے۔ 1960ء سے 1968ء تک لگنے والے ''نئے'' غیر ملکی سرمایہ کاری پر مشتمل تھا (۱۱۷)۔ اگر اس سے کوئی یہ نتیجہ اخذ کر لے کہ غیر ملکی سرمایہ دار کم از کم پاکستان میں کمائے ہوئے منافع کا کثیر حصہ تو دوبارہ یہیں لگا دیتے، تو یہ بھی صحیح نہیں ہوگا کیونکہ گو ''نئے'' سرمائے کا ایک تہائی کے لگ بھگ یہیں سے کمائے ہوئے منافع پر مشتمل ہے، پاکستان میں کمائے ہوئے منافع پر

مشتمل ہے، پاکستان میں کمائے ہوئے منافع کا بیشتر حصہ دوبارہ یہاں نہیں لگایا جاتا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار پاکستان میں کمائے ہوئے منافع کا کتنا حصہ دوبارہ یہاں لگاتے رہے ہیں، اس کا انداز ہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہوتا ہے (۱۱۸)۔

1964ء 36فیصد	1966ء 22فیصد
1965ء 31فیصد	1967ء 13فیصد
1968ء 17فیصد	

درحقیقت ابتدائی سالوں میں کچھ سرمایہ لگانے کے بعد غیر ملکی سرمایہ دار پاکستان میں سرمایہ لاتے کم اور لے جاتے زیادہ رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ (۱۱۹) نے پاکستان میں لگنے والے حقیقی نئے غیر ملکی سرمائے کے مقابلے میں غیر ملکی سرمایہ داروں کے ذریعے باہر جانے والے سرمائے کا تناسب حسب ذیل بتایا ہے (یہ اعداد و شمار پاکستان میں لگنے والے غیر ملکی سرمائے کے ہر ایک سو روپے پر باہر جانے والے روپے کی رقم کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں)

1964ء 205	1966ء 438
1965ء 223	1967ء 292
1968ء 223	

غیر ملکی سرمایہ داروں کے ہاتھوں جو روپیہ پاکستان سے باہر جاتا ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں: اپنی پونجی واپس لے جانا، منافع باہر لے جانا، قرض کی رقم واپس لے جانا، سود کی وصولی، تکنیکی مشورہ دینے کی فیس، رائلٹی اور پیٹنٹ فیس وغیرہ۔ (رائلٹی اور پیٹنٹ فیس ان مصنوعات پر لی جاتی ہے جو غیر ملکی تجارتی نام سے پاکستان میں بنا کر فروخت کی جاتی ہیں، مثلاً مختلف مشروبات، صابن اور ٹوتھ پیسٹ وغیرہ)۔ 1964ء سے لیکر 1969ء تک غیر ملکی سرمایہ داروں نے پاکستان سے 69 کروڑ 58 لاکھ روپیہ باہر بھجوایا (۱۲۰)۔ اس رقم کا 39 فیصد ٹیکنیکل فیس اور رائلٹی کی صورت میں تھا (۱۲۱)۔ نئے لگنے والے غیر ملکی سرمایہ میں سے باہر جانے والے منافع، ٹیکنیکل فیس، رائلٹی وغیرہ کی (لیکن سود کی نہیں) تفریق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ 1964ء سے 1968ء تک پاکستان سے غیر ملکی سرمایہ دار صاف صاف 3.3 کروڑ ڈالر (یعنی تقریباً ساڑھے سولہ کروڑ روپے) کی رقم اُڑا کر لے گئے (۱۲۲)۔

غیر ملکی سرمایہ کا طرزِ عمل:

پسماندہ ملکوں کو مجموعی طور پر لیا جائے تو وہاں غیر ملکی سرمایہ زیادہ تر تیل، معدنیات اور دوسرے خام مال کو نکال کر لے جانے پر لگایا جاتا ہے، اور صنعتی شعبہ میں اس کا تناسب بہت کم ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی شروع میں غیر ملکی سرمایہ دار تجارت اور کان کنی کو ترجیح دیتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ صنعتی شعبہ میں ان کی سرمایہ کاری کا تناسب بڑھنے لگا۔ 1960ء میں نئے غیر ملکی سرمایہ کا 26.8 فیصد، 1965ء میں 31.6 فیصد اور 1968ء سے لے کر 1970ء تک 80.7 فیصد صنعتی شعبہ میں لگایا گیا (۱۲۳)۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوا کہ غیر ملکی سرمایہ دار پاکستان کی صنعتی ترقی میں ہاتھ بٹا رہے ہیں، کیونکہ غیر ملکی سرمایہ کار 80 فیصد سے بھی زیادہ کیمیائی اور دواؤں کی صنعت میں لگایا جا رہا ہے (۱۲۴) اور یہ صنعتیں ملک کی معیشت کو آزاد کروانے کی بجائے اسے سامراجی ملکوں کا مزید محتاج بنا دیتی ہیں۔ اگر ہم دواؤں کی صنعت کے طرزِ عمل کا تجزیہ کریں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ غیر ملکی سرمایہ کاری پاکستان کی معیشت پر کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے اور غیر ملکی سرکاری امداد کس طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے اور غیر ملکی سرکاری امداد کس طرح سے اسے اس کردار کو ادا کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی ہے۔

پاکستان میں جو غیر ملکی دواؤں کی کمپنیاں تجارت کر رہی ہیں، ان میں سے سرِ فہرست بروز ویلکم، سینڈوز، وائتھ، وارنر لیمبرٹ، ایبٹ، فائزر، لیڈرلے، پارک ڈیویز، مرک، کارٹر والس اور جانسن اینڈ جانسن۔ اس فہرست کی آخری ۹ کمپنیوں کو کولی قرضے مہیا کیے گئے ہیں۔ ان کمپنیوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یا تو یہ سامراجی ملکوں میں اپنی صدر فیکٹریوں کا بنایا ہوا مال دوبارہ پیک کر کے فروخت کرتی ہیں یا سامراجی ملکوں سے منگوائے ہوئے خام مال اور فارمولے سے دوا سازی کرتی ہیں۔ ان کی کارکردگی کو کسی طرح سے بھی صنعت کاری نہیں کہا جا سکتا ہے۔

قیمتوں میں ہیرا پھیری کرنا، بلیک میلنگ کرنا اور دباؤ اور دھمکی سے کام لینا غیر ملکی دوا سازی کی کمپنیوں کے آزمائے ہوئے ہتھیار ہیں۔ ان کے کالے کرتوتوں کا پول اس وقت کھلا جب 1970ء میں امریکی سینٹ کی اُس کمیٹی نے دوا سازی کی کمپنیوں کے معاملات میں تحقیقات

شروع کی جس کا تعلق اجارہ داری سے ہے اور جس کے صدر سینیٹر گیلارڈ نیلسن (Gaylord Nelson) ہیں۔ ان کمپنیوں نے پاکستان میں جو اندھیر نگری مچائی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ امریکی دوا ساز و دوا فروش کمپنیوں نے عالمی منڈی یا امریکی بازار کے بھاؤ کے مقابلے میں پاکستان سے 80 گنا زیادہ تک قیمتیں وصول کیں۔ مختلف دواؤں پر مختلف امریکی کمپنیوں نے پاکستانی گاہکوں سے جو زائد قیمتیں وصول کیں ان کی چند مثالیں ہم گوشوارہ نمبر ۶ میں پیش کرتے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۶

دواؤں پر پاکستان سے لی گئی فیصد زائد قیمت

کمپنی	دوا کا نام	فیصد زائد قیمت
مرک	سپرو ہیپٹڈین	7805
	ڈائینیز و مائلکو ہیپٹرین	5171
	ہائپرڈین	4741
	ڈیکسامیتھیسون	3500
فائزر	ڈاکسی سائکلین	7292
	آکسی ٹیٹراسائکلین	516
سائنمڈ (لیڈرلے)	ڈائمیتھائل کلوروڈیٹراسائکلین	1875
	ٹرائی ایمسینولون	2538

Source: Pakistan Times, 23 September 1970

یاد رہے کہ یہ اعداد و شمار منافع کی شرح نہیں ہیں، کیونکہ منافع تو امریکہ اور عالمی منڈی میں بھی کمایا جاتا ہے۔ یہ اعداد و شمار اُس لوٹ کھسوٹ کی ترجمانی کرتے ہیں جو امریکی یا عالمی منڈی کے حساب سے شرح منافع وصول کرنے کے بعد پاکستان سے محض دھپل بازی میں کی گئی ہے۔ ان اعداد و شمار کو اس طرح سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر ڈیکسامیتھیسون پر زائد قیمت کی شرح 3500 فیصد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ دوا امریکہ میں یا کسی اور ملک کو ایک سو روپیہ میں فروخت

کی گئی تو پاکستانی گاہک سے 3500 روپیہ زائد یعنی کل 3600 روپیہ وصول کیے گئے۔ 7805 فیصد زائد قیمت کا مطلب ہوا جس دوا کی قیمت امریکہ میں ایک روپیہ وصول کی جاتی ہے وہ پاکستان کو 7 روپیہ پانچ پیسہ میں فروخت کی جاتی ہے۔ قیمتوں کی اس زیادتی میں درآمدی ڈیوٹی وغیرہ کا دخل نہیں ہے۔

اس لوٹ کھسوٹ میں امریکی حکومت جس طرح سے امریکی دواساز کمپنیوں کی مدد کرتی ہے اور جس چالبازی سے پاکستان میں جمع کیے ہوئے روپیہ کو ڈالر میں منتقل کرتی ہے، وہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ان دواؤں کو خریدنے کے لیے امریکہ کا امدادی ادارہ آے۔آئی۔ڈی (A.I.D) امریکی کمپنیوں کو دواؤں کی قیمت امریکہ میں ڈالروں میں ادا کر دیتا ہے۔ جس کے بعد حکومت پاکستان ان کمپنیوں کی پاکستان میں شاخوں کو لائسنس جاری کرتی ہے تاکہ وہ یہ دوائیں درآمد کر سکیں۔ اس کے بعد امریکی حکومت پاکستانی حکومت کو پاکستان میں جمع کیے ہوئے روپیوں (Counter-part Fund) میں سے قرضہ دیتی ہے۔ لیکن یہ قرضہ ڈالروں میں ادا کرنا ہوتا ہے اور اس پر سالانہ تین سے چار فیصد تک سود دینا پڑتا ہے۔ بظاہر سود کی یہ شرح کافی کم ہے اور حکومت پاکستان کو گھر بیٹھے قرضہ بھی مل جاتا ہے۔ لیکن اس نام نہاد سہولت کی وجہ سے پاکستان کو منہ مانگے دام دینے پڑتے ہیں۔ اور حکومت امریکہ کے جمع کیے ہوئے پاکستانی روپیوں کو ڈالروں میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت یہ سودا اس سودے سے بہت مہنگا پڑتا ہے جس کے تحت پاکستان نقد زرمبادلہ میں عالمی منڈی کے بھاؤ پر دوائیں خرید سکتا ہے۔

چونکہ یہ سارا دھندا پاکستان پر احسان جتاتے ہوئے کیا جاتا ہے، اس لیے سینیٹر نیلسن نے اے۔آئے۔ڈی کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے پوچھا تھا کہ حکومت پاکستان اس قسم کی تجارت کی کس طرح اجازت دے دیتی ہے اس پر اُس عہدیدار نے جواب دیا ''اگر وہ ان قیمتوں پر امریکی دوائیں درآمد کرنا چاہتے ہیں تو یہ اضافہ ان کا معاملہ ہے، ہمارا مسئلہ نہیں ہے'' اس پر سینیٹر نیلسن نے کہا ''میں تو کبھی بھی نہیں چاہوں گا کہ کوئی مجھ پر اس قسم کا احسان کرے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سراسر ظلم ہے۔'' (۱۲۵)

ان انکشافات کی وجہ سے پاکستان میں غیر ملکی دواؤں کی کمپنیوں کے خلاف شدید ردعمل ہوا۔ اخبارات نے اداریے لکھے اور سیاست دانوں نے رائے زنی کی اور محققوں نے مزید حقائق

سامنے لانے کی کوشش کی۔ اب اس بات کا بھی علم ہوگیا کہ خود پاکستان کے اندر غیر ملکی کمپنیاں جینرک (کیمیائی) ناموں پر بکنے والی دواؤں کے مقابلے میں اپنے تجارتی داموں کی شہرت سے فائدہ لیتے ہوئے کئی گنا زیادہ قیمت وصول کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں نئے وزیر صحت شیخ محمد رشید نے کچھ اعداد و شمار پیش کیے جو گوشوارہ نمبر ۷ میں درج کیے جا رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض دواؤں پر یہ کمپنیاں دس گنا، بعض پر 16 گنا اور بعض پر 33 گنا زیادہ قیمت وصول کر رہی تھیں۔ شیخ رشید نے اپنی سامراج دشمنی کا ثبوت دینے کے لیے دواؤں کی کمپنیوں کو نشانہ بنایا اور تجارتی ناموں کی جگہ کیمیائی ناموں سے دوائیں فروخت کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے بڑی سامراجی کمپنیوں کو اپنے نام اور اشتہار بازی سے فائدہ لے کر لوٹ کھسوٹ کرنے سے محروم کیا جا سکتا ہے اور ملک میں سامراجی مفادات کو دھچکا پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ پورے نظام کو بدلے بغیر کسی ایک شعبہ میں علیحدہ سے سامراجی تسلط کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ سامراجیوں نے اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے فوری اقدامات کرنا شروع کر دیے۔ ایک طرف تو اخبار و رسائل کے ذریعہ جینرک اسکیم کے خلاف پروپیگنڈہ مہم چلائی گئی اور مختلف انجمنوں کے ذریعہ اس اسکیم کے خلاف قراردادیں پاس کروائی گئیں اور صدر اور وزیروں کی طرف وفد بھیجے گئے، تو دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی وزارت خارجہ نے بھی ٹیلی گرام بھیجا کہ اس اسکیم کو نافذ نہ کیا جائے۔ اس دباؤ میں آ کر حکومت پاکستان نے پہلے تو چھ مہینے کے لیے اس اسکیم کو معطل کر دیا، جس دوران دوا ساز کمپنیوں نے ذخیرہ اندوزی کر کے قیمتیں بڑھا دیں۔ بعد میں اس اسکیم کو ایک پھس پھسی شکل میں پیش کیا گیا۔ کمپنیوں نے جینرک اسکیم کو بھی اپنے حق میں پلٹ دیا اور ایک سال کے اندر اندر اکثر دواؤں کی قیمتیں دوگنی ہوگئیں (۱۲۶)۔ اس طرح سے غیر ملکی کمپنیاں جیت گئیں، شیخ رشید ہار گئے اور پاکستان کی سیاسی فرہنگ اصطلاحات میں نیک نیت لیکن غیر عملی سوشلسٹوں کے لیے ایک نئی اصطلاح نے جنم لیا: جینرک سوشلسٹ۔ اس سال تو بچی کھچی جینرک اسکیم کو بھی ختم کر دیا گیا ہے، مگر اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خود غیر ملکی کمپنیوں کو بھی اس اسکیم کے ختم ہونے پر افسوس ہے کیونکہ انہوں نے اس کو اس طرح سے اپنے تابع کر دیا تھا کہ ان کو پہلے سے بھی بڑھ کر فائدہ ہو رہا تھا۔ افسوس کرنے کی کوئی بات نہیں، جب تک ان کمپنیوں کے پاس دواؤں کی اجارہ داری ہے، جب تک ان کے

پاس سیاسی اثر ورسوخ ہے اور جب تک افسروں کو رشوت کھلانے کے لیے دولت ہے، اس وقت تک وہ ہر اسکیم کو اپنے گھر کی لونڈی بنا سکتی ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۷

کیمیائی ناموں کے مقابلے میں تجارتی ناموں پر دواؤں کی زائد قیمت

کمپنی	دوا کا نام	فیصد زائد قیمت
فائزر	ٹیرامائسن	500
	ڈیلٹا کورٹرل	238
روش	ویلیم (۲ ملی گرام)	1038
	ویلیم (۵ ملی گرام)	1600
سیبا	سیبازول	163
ایس کے ایف	فیورنڈینٹین	3033
پارک ڈیوس	کلورومائسٹین	373
گلیکسو	سیلین (فورٹیفائڈ)	328
نیکولس	ایسپرو	635

Source: Shaikh Mohammad Rasheed, Health Minister,

Dawn, 30 May 1972

ایندھن پر کنٹرول:

گو کہ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی کل مالیت بہت زیادہ نہیں ہے، پھر بھی یہ سرمایہ کاری بعض ایسے شعبوں میں کی ہوئی ہے کہ جس سے پورے ملک کی معیشت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہے ایندھن، خاص طور پر تیل اور گیس۔ پاکستان میں اٹک کے مقام پر جو تھوڑا بہت تیل نکالا جاتا ہے وہ بھی ایک بھی ایک برطانوی کمپنی کے ہاتھوں

میں ہے۔ تیل کی زیادہ ضرورت درآمد کے ذریعہ پوری کی جاتی ہے۔ یہ تیل نہ فقط انٹرنیشنل شیل، اسٹینڈرڈ ویکیوم، کالٹیکس اور دیگر بین الاقوامی تیل کی کمپنیاں بھی برآمد کرتی ہیں۔ تیل صاف کرنے کے کام میں بھی غیر ملکی کمپنیوں کا دخل ہے۔ پاکستان ریفائنری لمیٹڈ کا اکثریتی سرمایہ چار غیر ملکی کمپنیوں، یعنی برما آئل آف لندن، شیل، اسٹینڈرڈ اور کالٹیکس کے ہاتھوں میں ہے۔ سوئی گیس نکالنے والی کمپنی پاکستان پیٹرولیم لمیٹڈ اور گیس کی صفائی اور تقسیم کرنے والی سوئی گیس ٹرانسٹیشن کمپنی کے اثاثوں کی اکثریت بھی سامراجی کمپنی برما آئل کمپنی کی ملکیت ہے۔ اس کے بعد تین مقامی کمپنیاں گیس کی علاقائی تقسیم کا کام انجام دیتی ہیں۔ تیل اور گیس پر غیر ملکی کنٹرول پاکستان کی معیشت اور دفاع کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے اس کا اندازہ ہم بخوبی کر سکتے ہیں۔ 1965ء کی جنگ کے دوران ایسو اور کالٹیکس نے پاکستان ریفائنری کو متوقع مقدار میں تیل نہیں پہنچایا جس کی وجہ سے اسے دو ہفتے تک تیل کی سپلائی میں کمی کرنی پڑ گئی (۱۲۷)۔

کوکا کولا، سیون اپ، اگلو، پولکا:

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعہ پاکستان سے جو منافع باہر لے جایا جا رہا ہے اس کا ایک حصہ اس فیس اور کمیشن پر مشتمل ہے جو غیر ملکی کمپنیاں اپنے مال کے نام اور فارمولا استعمال کرنے کے عوض وصول کرتی ہیں۔ غیر ملکی کمپنیاں اپنے مال کے نام اور فارمولا استعمال کرنے کے عوض وصول کرتی ہیں۔ غیر ملکی ناموں کے تحت اشیاء یہاں بنائی جاتی ہیں اس کا پیداوار سے کوئی تعلق نہیں، اور ان سے عوام کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، بلکہ ان کی وجہ سے مقامی کاروبار کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس قسم کی فضول سرمایہ کاری کی ایک مثال غیر ملکی مشروبات کی صنعت ہے۔ پاکستان میں خوش قسمتی سے بہت سے روایتی مشروبات، جیسے کے حکیموں کے شربت، لسی، گنے کا رس اور سندھی مشروب تھادل وغیرہ موجود تھے جو کہ نہ صرف فقط لذیذ و فرحت بخش ہیں بلکہ توانائی بھی بخشتے ہیں۔ ان کے علاوہ سوڈا بوتل کی مقامی کمپنیاں بھی موجود تھیں۔ جو مقامی ضروریات کو اچھی طرح سے پورا کر سکتی تھیں۔ کراچی میں این۔ حسن علی اور نسروانجی کمپنیاں پہلے سے ہی معیاری مشروبات تیار کرتی تھیں۔ پھر پاکولا اور راجرس نامی مقامی کمپنیوں نے بھی

بڑے پیمانے پر سوڈا بوتل کا کاروبار شروع کر دیا۔ لیکن صاحب لوگوں کے ذوق کو پورا کرنے کے لیے اور دلالی سے روپیہ کمانے کی غرض سے سامراجی ملکوں کی مشہور مشروبات کا کاروبار پاکستان میں شروع کر دیا گیا۔ سب سے پہلے مشہور عالم کوکا کولا آیا جس نے ایک نیا ذائقہ دے کر غیر ملکی مشروبات کے لیے پاکستان کی منڈی کے دروازے کھول دیئے۔ آہستہ آہستہ کولا، سیون اپ، فینٹا، ببل اپ، ڈبل کولا، کینا ڈا ڈرائی، ہما فمینز، اسپرائٹ، آرسی کولا، ایپل سڈرا، ارنج کرش وغیرہ آ گئے۔ اب خدا کے فضل سے کرش کولا بھی آ گیا ہے۔ انتظار فقط ڈاکٹر پیپر اور ماؤنٹین ڈیو کا ہے۔ دراین اثنا پاکستان کی مقامی سوڈا بوتل کی صنعت تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے غیر ملکی سرمایہ پاکستان میں صنعت کاری کو فروغ دے رہا ہے۔ ابھی ان کولاؤں اور غیر کولاؤں کی یلغار جاری تھی کہ غیر ملکی آئس کریم کا سیلاب بھی شروع ہو گیا۔ پہلے تو معاملہ فقط سنو کریسٹ اور ایم ایف تک محدود تھا۔ اب تو جگہ جگہ اگلو، پولکا، اور اسکیمو کے بوتھ دکھائی دیتے ہیں۔ دو آنے کی قلفی کھانے والے بچے اب سوا روپیہ کے کون سے کم کی بات نہیں کرتے۔ تکنیکی نقطہ نظر سے ایسا کون سا مسئلہ درپیش ہے کہ پاکستان میں غیر ملکی مداخلت کے بغیر شربت اور آئس کریم نہیں بن سکتے اور مقامی نام سے نہیں بک سکتے؟

اس طرح غیر ملکی ناموں کے تحت بننے والے ٹوتھ پیسٹ اور صابن، جو اپنی ہم نام اصلی مصنوعات سے کسی طرح بھی مشابہت نہیں رکھتے، پاکستان کی سستی مزدوری اور سستے خام مال کے باوجود امریکہ کی قیمتوں سے بھی زیادہ مہنگے ہیں۔ یونی لیور کارپوریشن کی ذیلی شاخ لیور برادرز لکس صابن کو امریکہ اور یورپ کے مقابلہ میں پاکستان میں زیادہ دام پر فروخت کرتی ہے۔ اس قسم کی غیر ملکی سرمایہ کاری سے پاکستان کو کیا فائدہ ہے؟

غیر ملکی سرمایہ کا ایک اور پسندیدہ کاروبار غیر ملکی اور پاکستانی رئیسوں کے لیے شاہی ہوٹل تعمیر کرنا اور چلانا ہے۔ پین امریکن ہوائی جہاز کمپنی نے پاکستان سروسز لمیٹڈ کے ساتھ مل کر ملک بھر میں ہوٹل انٹرکانٹینٹل کا جال بچھا دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انہیں امریکی حکومت کی طرف سے 1966ء تک 6 کولی قرضے دیے گئے تھے۔ (۱۲۸) اب ہلٹن، شیریٹن، ہائے اٹ، اور ہالیڈے ان پاکستان میں جگہ جگہ عالیشان ہوٹل تعمیر کر رہے ہیں۔ اس قسم کی سرمایہ کاری کا ملک کی معاشی ترقی پر منفی اثر پڑتا ہے۔

مستفید ہونے والے گماشتے:

1962ء میں پاکستان میں جن کمپنیوں میں غیر ملکی سرمایہ لگا ہوا تھا، وہ مصنوعات کے کاروبار کے 27 فیصد سرمائے، گیس، بجلی وغیرہ (Utilities) کے 23 فیصد سرمائے، تعمیرات کے 32 فیصد سرمائے اور ذرائع نقل و حمل، مواصلات اور گودام میں رکھنے کے اخراجات کے 54 فیصد سرمائے کی مالک تھیں (۱۲۹)۔ اس پیمانے پر غیر ملکی سرمایہ کے اثر کی وجہ سے گماشتہ سرمایہ داروں کا ایک وسیع جال بچھ گیا ہے۔ وہ پاکستانی کمپنیاں جنہوں نے غیر ملکی سرمایہ کے اشتراک کے ساتھ کاروبار کیا ہے اُن کے چند ڈائریکٹروں کے نام یہ ہیں: حبیب، سہگل، آدم جی، چنائی، داؤد، دادا، امین، رنگون والا، حئی سنز، جنرل حبیب اللہ، کاوسجی، ڈنشا، حبیب ابراہیم رحمت اللہ، وزیر علی، ہارون، باوانی، فینسی، فیروز سنز، ولیکا اور مزاری۔

غیر ملکی سرمایہ داروں کا سرمایہ لگانے کے علاوہ بہت سے پاکستانی سرمایہ داروں نے غیر ملکی نجی ذرائع سے قرضے بھی حاصل کیے ہیں۔ 1960ء سے لے کر 1969ء تک غیر ملکی نجی ذریعوں سے پاکستانی سرمایہ داروں کو 60 کروڑ 95 لاکھ روپیوں کے قرضے دیے گئے (۱۳۰)۔ ان قرضوں سے مستفید ہونے والی کمپنیوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:

حئی سنز شوگر ملز	ولیکا کیمیکلز
باوانی شوگر ملز	سوئی گیس ٹرانسمیشن کمپنی
حبیب شوگر ملز	پاکستان ریفائنری لمیٹڈ

مندرجہ بالا جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ پاکستان میں غیر ملکی نجی سرمایہ کی رقم بہت زیادہ نہیں پھر بھی سرمایہ کاری سے سامراجی ایک طرف تو بہت زیادہ منافع کماتے ہیں اور دوسری طرف وہ پاکستان کی پیداواری قوتوں کو آگے بڑھانے کی بجائے گماشتوں کا ایک جال بچھا کر پسماندگی اور معاشی مفلوجی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غیر ملکی سرمایہ داروں کو یہ رول ادا کرنے میں غیر ملکی سرکاری امداد کے ذریعہ تقویت پہنچائی جاتی ہے۔

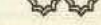

چھٹا باب

تجارت یا لوٹ مار

''اس مالی سال میں اے آئی۔ڈی کے قرضوں سے خریدی ہوئی اجناس کا 98 فیصد امریکہ سے خریدا جائے گا۔ اس طرح سے امریکی تاجروں اور مزدوروں کو ملازمتیں اور مزید آمدنی مہیا ہوگی، اور ہمارے برآمدات کے لیے منڈیاں وسیع ہوں گی۔'' جی اے ہنا، اے آئی ڈی کے سربراہ، بیرونی امداد کے قانون پر ایوان کی کاروائی، سال 1969ء

''ہم جس بات کی کوشش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہے اُس حد تک ہم اپنے امدادی پروگرام کو استعمال کرتے ہوئے امداد حاصل کنندگان کو آمادہ کریں اور اُکسائیں کہ وہ خود اپنے زرمبادلہ کا یعنی اپنے غیر پابند خزانے کا زیادہ حصہ امریکہ میں خرچ کریں۔'' ولیم گوڈ، اے آئی ڈی کے سربراہ، ایوان نمائندگان کی خارجہ امور کی کمیٹی کی کاروائی، سال 1967ء

عام طور پر اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی تجارت زیادہ تر آپس میں ہی ہوتی ہے اور تیسری دنیا کے غریب ممالک کے ساتھ تجارت ان کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ پھر بھی اگر حقائق کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سامراجی ملکوں کے لیے تیسری دنیا کے ساتھ تجارت، مقدار (۱۳۱)، اور منافع (۱۳۲) کے لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ امریکہ اپنے برآمدات کا ایک تہائی پسماندہ ملکوں کو فروخت کرتا ہے (۱۳۳)۔ اس منڈی کو

برقرار رکھنے اور وسیع کرنے کے لیے بیرونی امداد کا پروگرام نہایت اہم کردار انجام دیتا ہے۔ غریب ملکوں کو امداد دے کر امریکہ اور دوسرے سامراجی ممالک نہ فقط فوری طور پر اپنے مال کو فروخت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، بلکہ منڈیاں مستحکم کرنے میں بیرونی امداد کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ پاکستان میں، جہاں بیرونی نجی سرمایہ کی لاگت بہت زیادہ نہیں ہے، بیرونی تجارت امداد مہیا کرنے والے ممالک کے لیے دولت واپس لے جانے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

پاکستان کو ملنے والی امریکی امداد کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امدادی پروگرام کا رجحان زیادہ تر پاکستان میں امریکی مال فروخت کرنے کی طرف ہے۔ سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1970ء تک ملنے والی امریکی امداد کا 13.31 فیصد عوامی قانون 480 یا پی ایل 480 کے قرضوں اور عطیوں کی شکل میں تھا (۱۳۴)۔ اس پروگرام کا مقصد ہی امریکہ کی فاضل زرعی پیداوار کی نکاسی کرنا ہے۔ اگر اس فاضل پیداوار کو کسی نہ کسی طرح نہ نکالا جائے تو امریکہ میں ان اشیاء کی قیمت بہت گھٹ جائے گی اور کاشتکار کو خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملے گا۔ اگر اس کو آڑے وقت کے لیے گوداموں میں رکھوا دیا جائے تو گودام کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں، اور یہ طریقہ بھی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ تیسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ گندم اور دیگر فاضل زرعی پیداوار کے ڈھیر لگا کر آگ لگا دی جائے یا ان کو سمندر میں پھینک دیا جائے۔ قیمتوں کو مستحکم کرنے کے لیے یہ طریقے اکثر استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکہ نے پوری دنیا میں اپنا اثر جمانا شروع کیا تو اسے خیال آیا کہ اس فاضل زرعی پیداوار کو ایک موثر سیاسی اور اقتصادی آلہ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اب یہ گندم امداد کے طور پر غریب ملکوں کو دی جاتی ہے، ماہرین معاشیات کا اندازہ ہے کہ ایسی امداد دینے سے امریکہ کو کوئی قیمت ادا کرنی نہیں پڑتی۔ اگر یہ سب کی سب امداد عطیہ کی صورت میں بھی دی جائے تو بھی امریکہ کو اقتصادی طور پر فائدہ ہی ہو سکتا ہے، نقصان نہیں، کیونکہ ایسا نہ کرنے سے خواہ گھریلو یا بیرونی منڈی میں دام گر جائیں گے اور اسٹوریج کا خرچ بہت بڑھ جائے گا (۱۳۵)۔ متبادل استعمال سے جو نفع یا نقصان ہوتا ہے اس کے پیمانے کو معاشیات کی زبان میں ''آپرچیونیٹی کاسٹ'' (Opportunity Cost) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ ہم ''قیمت متبادل استعمال'' کر سکتے ہیں۔ فاضل گندم کو امدادی طور پر دینے سے امریکہ کے لیے قیمت متبادل استعمال منفی ہے، یعنی کھلی

منڈی میں اس گندم کو بیچنے سے بال آخر نقصان ہوتا ہے۔

پاکستان کو پی ایل 480 کے تحت ملنے والی امداد کا رجحان بہت دلچسپ ہے۔ یہ امداد عطیہ اور قرضہ دونوں صورتوں میں دی گئی ہے، لیکن عطیہ کی صورت میں ملنے والی اس امداد کا 90 فیصد 1965ء سے پہلے دیا گیا تھا جب پاکستان اور امریکہ کا اتحاد اپنے شباب پر تھا۔ رفتہ رفتہ ٹائیٹل II اور ٹائیٹل III کے تحت دیئے جانے والے عطیے بند کر دیے گئے، اور پی ایل 480 کے تحت ملنے والی تمام تر امداد ٹائیٹل I کے قرضوں کی صورت میں ملنے لگی۔ یہ قرضے بظاہر پاکستانی روپوں میں ادا کیے جا سکتے تھے، لیکن سال 68-1967ء سے یہ شرط بھی عائد کر دی گئی کہ ان قرضوں کے 80 فیصد تک کی ادائیگی امریکی ڈالروں میں کی جائے (۱۳۶)۔ اس طرح سے پہلے مفت کا مال کھلا کر پاکستان کو امریکہ کی فاضل زرعی اشیاء کا عادی بنا دیا گیا۔ پھر اس کی قیمت مانگی گئی لیکن پاکستانی روپوں میں تاکہ اسے یہ بوجھ محسوس نہ ہو، لیکن جب پاکستان ان اشیاء کا مکمل طور پر عادی ہو گیا تو اس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ فاضل زرعی پیداوار کی قیمت ڈالروں میں ادا کرے۔ اس پالیسی کے تحت پاکستان کی بناسپتی گھی کی صنعت کو امریکہ سے درآمد شدہ سویابین کا محتاج بنا دیا گا، لیکن جب سویابین کی قیمت ڈالروں میں طلب کی گئی تو پاکستان کے زرمبادلہ پر بہت دباؤ پڑا اور گھی کی صنعت میں بحران پیدا ہو گیا۔

پی ایل 480 کے علاوہ ایک اور امدادی پروگرام جس کا تعلق براہ راست امریکی مال کے لیے پاکستان میں منڈی پیدا کرنا ہے، وہ ہے امریکہ کے بنک برائے برآمد و درآمد کے قرضے۔ یہ قرضے پاکستان کو محض امریکی اشیاء درآمد کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں۔ 1970 تک پاکستان کو اس بنک کے 24.15 کروڑ ڈالر کے قرضے دیے جو کل امریکی اقتصادی امداد کا 8.23 فیصد تھا (۱۳۷)۔ اس کے علاوہ سپلائرز کریڈٹ کے قرضے بھی تجارت کو فروغ دینے کے لیے دیے جاتے ہیں۔

جہاں تک کہ بقایا 78 فیصد امریکی اقتصادی امداد کا تعلق ہے تو وہ بھی زیادہ تر امریکی مال درآمد کرنے پر خرچ کی جاتی ہے، چاہے وہ بظاہر صنعتی ترقی یا زرعی ترقی کے نام پر دی جاتی ہے، چاہے وہ بظاہر صنعتی ترقی یا زرعی ترقی کے نام پر دی جاتی ہو 1966ء تک بقایا امداد کا 65.5 فیصد امریکی مال درآمد کرنے پر خرچ کیا گیا (۱۳۸)۔ اس طرح سے ترقیاتی منصوبوں کے لیے منظور

شدہ، امداد (Project Assistance) کا ایک بڑا حصہ امریکی مصنوعات کی درآمد پر خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی امداد کا کافی حصہ امریکی ماہرین کی تنخواہوں، فیس اور خدمات پر صرف ہوتا ہے۔

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ امریکی امدادی ادارے کے سابق سربراہ، ہنا نے، جس کے بیان کا اقتباس ہم نے اس باب کے شروع میں دیا ہے، کیوں اس خود اعتمادی کے ساتھ کہا تھا کہ امریکی امداد سے خریدی ہوئی اجناس کا 98 فیصد امریکہ سے ہی خریدا جائے گا۔ لیکن معاملہ امریکی امداد کو امریکی مال کی درآمد پر صرف کرنے تک ختم نہیں ہوتا۔ امریکی امداد کے ذریعے جو ترقیاتی منصوبے عمل میں لائے جاتے ہیں، ان کی وجہ سے امریکی مشینری، پرزے، خام مال، فارمولا اور تکنیکی مشوروں کی مسلسل مانگ پیدا ہو جاتی ہے جو امدادی رقم ختم ہو جانے کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے صدر کینیڈی نے کہا تھا:

> ''اس بات پر بہت کم توجہ دی گئی ہے کہ امریکی مصنوعات، ہنر اور امریکی طور طریقے کس طرح سے نئے ابھرتے ہوئے ملکوں کے ذوق اور خواہشات کو متعین کرنے میں کردار ادا کرتے ہیں، یا اس بات پر کہ جب ہماری امداد ختم ہو جاتی ہے پھر بھی ہماری مصنوعات کے لیے خواہش اور ضرورت جاری رہتی ہے اور تجارتی تعلقات امداد ختم ہونے کے مدتوں بعد تک برقرار رہتے ہیں۔'' (۱۳۹)

صدر کینیڈی نے پاکستان کو بھی ان ممالک میں شامل کیا جن کے تجارتی تعلقات کی نوعیت امریکی امداد کی وجہ سے بدل گئی ہے۔ سامراجی امداد نے کس طرح سے پاکستان میں سامراجی منڈی کو وسیع اور مستحکم کیا ہے اس کی چند مثالیں ہم نیچے پیش کرتے ہیں۔

''سبز انقلاب'':

ہم چوتھے باب میں اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ امریکی حکمت عملی کے تحت کس طرح سے پاکستان کی زراعت میں جدید کاشتکاری کے 'سبز انقلاب' کا آغاز کیا گیا اور پاکستان کی معیشت پر اس کا کیا اثر پڑا۔ یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ 'تکنیکی امداد' کے اس منصوبے کی وجہ سے سامراجی ملکوں کو پاکستان میں اپنی تجارت کو فروغ دینے میں کس طرح سے مدد ملی۔ ''سبز انقلاب'' کے

مشہور ڈھنڈورچی اور امریکی ماہر زراعت لیسٹر براؤن (Lester Brown) نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> ''1960ء کی دھائی کے وسط میں، بمعہ بھارت اور پاکستان کے، کئی ایک ملکوں کو امریکی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی (اے۔آئی ڈی) کی طرف سے قرضے دیے گئے تاکہ وہ کھاد خرید سکیں جس کی انہیں بری طرح سے ضرورت تھی۔ اس وقت امریکی حکومت اور عالمی بینک نے دونوں ملکوں، خاص طور پر ہندوستان، پر کافی دباؤ ڈالا کہ وہ بین الاقوامی کارپوریشنز کی مقامی پیداوار میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے ہمت افزائی کریں۔''(۱۴۰)

اس دباؤ اور ہمت افزائی کے نتیجے میں پاکستان میں کیمیائی کھاد کی اوسط سالانہ درآمد 1960-61ء سے لے کر 1964-65ء تک کی چار سالہ مدت میں 58.6 لاکھ ڈالر سے بڑھ کر 1965-66 سے لے کر 1970-71ء تک کی پانچ سالہ مدت میں 4.12 کروڑ ڈالر ہوگئی۔ اس طرح سے 'سبز انقلاب' کے پہلے چھ سالوں میں 25 کروڑ ڈالروں کی کیمیائی کھاد درآمد کی گئی (۱۴۱)۔ اس رقم میں وہ خرچ شامل نہیں ہے جو پاکستان میں کیمیائی کھاد کی فیکٹریاں لگانے کے لیے مشینری اور خام مال درآمد پر کیا گیا۔

'سبز انقلاب' کی وجہ سے سامراجی ملکوں سے ٹریکٹروں کی درآمد بھی کافی بڑھ گئی۔ 1962ء سے لے کر 1970ء تک مغربی پاکستان میں 26 ہزار ٹریکٹر درآمد کیے گئے، جو کہ زیادہ تر میسی فرگوسن، انٹرنیشنل ہارویسٹر فورڈ، جان ڈیئر، اور ڈوئٹز کمپنیوں سے منگوائے گئے اور جن کی فی کس درآمدی (C.I.F) قیمت دس ہزار روپیہ تھی۔ اس طرح سے ان آٹھ سالوں میں ٹریکٹروں کی درآمد پر کل ساڑھے پانچ کروڑ ڈالر خرچ کیے گئے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کردہ فارم میکنائزیشن کمیٹی کے تخمینے کے مطابق مغربی پاکستان میں ٹریکٹروں اور دیگر زرعی مشینوں کی درآمد پر سالانہ خرچ کی لاگت 1969ء میں دو کروڑ ڈالر سے بڑھ کر 1985ء تک 10.2 کروڑ ڈالر ہو جاتی تھی (۱۴۲)۔ اس طرح سے 17 سالوں میں 97.2 کروڑ ڈالر کا زرمبالہ خرچ ہوتا۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق 1970-71ء سے لے کر 1973-74 تک زرعی مشینری اور پرزوں کی درآمد پر 39

کروڑ 39 لاکھ روپے (یعنی تقریباً ساڑھے چار کروڑ ڈالر خرچ ہوئے (۱۴۳)۔ زرعی مشینری کی درآمد میں اضافہ درحقیقت 1974ء کے بعد میں ہی شروع ہوا ہے۔ اور اس سال کے آخر تک نئے درآمد ہونے والے ٹریکٹروں کی تعداد 25 سے 30 ہزار تک پہنچ جائے گی اور اس پر لاگت اور بھی زیادہ ہوگی کیونکہ اب ٹریکٹروں کی درآمدی قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ٹریکٹروں کی درآمد کی ہمت افزائی کرنے کے لیے برطانیہ، مغربی جرمنی، بین الاقوامی ترقیاتی انجمن اور دیگر غیر ملکی ذرائع سے رانا ٹریکٹرز، شاہنواز، علی آٹوموبائلز، آدم جی، جی ٹی ایم سی، جیلانی اور زرعی مشینری درآمد کرنے والی دیگر کمپنیوں کو قرضے دیے گئے۔ (۱۴۴)

ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی جماعت، تنظیم برائے اقتصادی تعاون و ترقی یا اوای سی ڈی (O.E.C.D) کے ترقیاتی مرکز نے پاکستان میں 'سبز انقلاب' پر خرچ ہونے والے زرمبادلہ کا حساب لگاتے ہوئے بتایا کہ 1960ء کی دھائی کے آخری سالوں میں سالانہ 14 کروڑ ڈالر کی رقم اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھی (۱۳۵)۔ درحقیقت اس ادارے نے اس رقم میں ڈیزل کا خرچ شامل نہیں کیا اور زرعی مشینری کا خرچ حقیقی خرچ سے کم بتایا۔

'سبز انقلاب' کی وجہ سے درآمدات میں جو اضافہ ہوا اس کا صحیح تخمینہ لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس رقم میں ڈیزل پر خرچ ہونے والا زرمبادلہ بھی شامل کریں۔ فارم میکنائزیشن کمیٹی نے زرعی مشینری اور ٹیوب ویل پر سالانہ خرچ ہونے والے ڈیزل کا تخمینہ مختلف سالوں کے لیے اس طرح پیش کیا ہے:

سال	زرعی مشینری	ٹیوب ویل
1970	3.8 کروڑ گیلن	7.8 کروڑ گیلن
1975	7.5 کروڑ گیلن	12.0 کروڑ گیلن
1980	13.0 کروڑ گیلن	
1985	18.0 کروڑ گیلن	

مندرجہ بالا حساب لگاتے وقت زرعی مشینری کی کمیٹی نے اندازہ لگایا تھا کہ 1975ء تک مغربی پاکستان میں 48,535 ٹریکٹر اور 1450 کمبائن ہارویسٹر کام کر رہے ہوں گے، لیکن اس

وقت درحقیقت زیر استعمال زرعی مشینری کی تعداد اس اندازے سے کچھ کم ہے، جبکہ ڈیزل کی قیمت غالباً دوگنی ہوگئی ہے۔ اگر ڈیزل کی قیمت 1968ء کے نرخ کے مطابق لگائی جاتی تو 1970ء میں ٹریکٹروں اور ٹیوب ویلوں کے لیے ڈیزل پر 70 لاکھ ڈالر کا زرمبالہ خرچ ہوتا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے کہ 'سبز انقلاب' کو فروغ دینے کے لیے سامراجی ملکوں نے پاکستان کو زرعی مشینری، کیمیائی کھاد اور دیگر اشیاء درآمد کرنے کے لیے کچھ قرضہ مہیا کیا تھا، لیکن کل خرچ میں اس قرضے کا تناسب بہت کم ہے۔ سامراجیوں کی توقعات کے مطابق نہ فقط اس قرضے کو سامراجی ملکوں سے مال منگوانے پر خرچ کیا گیا، بلکہ اس سے کئی گنا بڑی رقم پاکستان کے اپنے کمائے ہوئے زرمبادلہ سے ان اشیاء کی درآمد پر خرچ کی گئی۔ یہی وہ مقصد ہے جس کا ذکر اے آئی ڈی کے سابق سربراہ ولیم گوڈ نے اس بیان میں کیا ہے جس کا اقتباس ہم نے اس باب کے آغاز میں پیش کیا ہے۔

جنگی سامان کی تجارت:

امریکہ کا اتحادی ہونے کی وجہ سے پاکستان کو امریکہ سے فوجی امداد ملتی رہی ہے۔ بقول اسکندر مرزا کے، امریکہ نے پاکستان کو (1970ء تک) ڈیڑھ ارب ڈالر کی فوجی امداد دی (۱۳۶)۔ یہ بات اب تک واضح نہیں ہے کہ اس 'امداد' کا کتنا حصہ عطیوں پر مشتمل تھا۔ کتنا قرضوں پر اور کتنا نقد خریداری کی صورت میں تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس سودے کو امداد کہا جاتا ہے وہ درحقیقت نقد خرید کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر 1971ء میں جب کئی امریکی سینیٹر پاکستان کو فوجی 'امداد' دینے کی مخالفت کر رہے تھے، اس وقت ہو یہ رہا تھا کہ امریکہ نقد داموں میں پاکستان کو اسلحہ بیچ رہا تھا۔ اس سال امریکہ نے 3.9 کروڑ ڈالر کا جنگی سامان پاکستان کو فروخت کیا (۱۳۷)۔

فوجی امداد کے نام پر تجارت کو بڑھانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ فوجی امداد میں تجارتی پہلو کس حد تک کارفرما ہے اس کا اندازہ امریکی ہوائی فوج کے میجر جنرل جان مونچش (John O. Moench) کے ایک مضمون سے ہوسکتا ہے، جس میں اس فوجی افسر نے لکھا ہے:

> ''فوجی امداد کے عطیوں میں دی جانے والی رقم کا 99 فیصد امریکہ میں خرچ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت ہم بیرونی ملکوں کو روپیہ نہیں

دیتے۔ ہم انہیں اسلحہ، ساز و سامان، تعاون، مشورہ اور خدمات مہیا کرتے ہیں۔ اور وہ بھی فقط وہ چیزیں جنہیں ہم ضروری سمجھتے ہیں۔" (۱۳۸)

لیکن قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔ جنرل موئنش آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"امریکہ کے جنگی سامان اور ٹیکنالوجی کے پھیلنے کی وجہ سے مسلسل طور پر امریکی جنگی اور غیر جنگی سامان کی تجارت کے لیے میدان ہموار ہوتا ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ اگر امریکہ نے کسی ملک کو عطیہ میں کچھ جنگی سامان دے دیا تو وہ ملک ایک طویل عرصہ تک اس کے کل پرزے امریکہ سے درآمد کرتا رہے گا۔ اس کے علاوہ جب ایک فوج کسی ایک ملک کے بنائے ہوئے ہتھیاروں کی عادی ہو جاتی ہے تو اس کی کوشش یہ ہی رہتی ہے کہ ضرورت کا مزید اسلحہ بھی اسی ملک سے منگوایا جائے۔ پھر اس کے لیے چاہے اسے کوئی غیر ملکی امداد نہ ملے۔ امریکی فوجی امداد ملنے کی وجہ سے پاکستان کے داخلی اقتصادی وسائل پر جو اثر پڑا اس کا ذکر کرتے ہوئے اے۔ آئی۔ ڈی کے سابق سربراہ ڈیوڈ بیل (David Bell) نے امریکی ایوان نمائندگان کی خارجہ امور کی کمیٹی کو بتایا:

".....اس نتیجہ سے گریز نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کی، جو کہ پہلے ہی اپنے وسائل کا بہت بڑا حصہ فوجی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا، امریکی فوجی امدادی پروگراموں کی وجہ سے ہمت افزائی ہوئی کہ وہ فوجی مقاصد کے لیے اور بھی زیادہ خرچ کرے۔"

"ظاہر ہے کہ اس طرح سے اقتصادی ترقی کا مسئلہ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔" (۱۳۹)

اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ امریکہ سے فوجی اتحاد نہ کرنے کی صورت میں پاکستان کو اپنی دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عالمی منڈی میں کیا قیمت متبادل استعمال ادا کرنی پڑتی۔

سیاسی شرائط اور دباؤ:

جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے، سامراجی ملکوں کی طرف سے دیے جانے والے قرضوں اور ا

ن کی ایماء پر عمل میں لائے جانے والے منصوبوں کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے اور ان میں ایسی شرائط شامل ہوتی ہیں جس سے امداد حاصل کرنے والے ملک کو امداد دینے والے ملک سے مال درآمد کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور ایسی صورتِ حال پیدا کی جاتی ہے کہ امداد حاصل کرنے والا ملک امدادی رقم ختم ہوجانے کے بعد یا امدادی منصوبہ پورا ہوجانے کے بعد بھی مسلسل امداد دینے والے ملک سے خود اپنے زرمبادلہ میں مال درآمد کرتا رہے۔ اس قسم کی شرائط کو ہم امدادی پروگرام کی ساختی شرائط کہہ سکتے ہیں۔ ان ساختی شرائط کے علاوہ سامراجی ممالک امداد حاصل کنندہ ممالک پر سیاسی شرائط عائد کرتے ہیں اور دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ یہ ملک سامراجیوں کے 'دشمن' ممالک کے ساتھ تجارت نہ کریں یا اپنی داخلی تجارتی پالیسیوں میں اس قسم کی تبدیلیاں کریں جن سے سامراجی ممالک کی تجارت کو فروغ حاصل ہو۔ پاکستان کی تجارت پر امریکہ کی طرف سے عائد کی ہوئی سیاسی شرائط کی ایک مثال پاکستان اور امریکہ کا وہ باہمی دفاعی معاہدہ ہے جس پر انہوں نے 1954 میں دستخط کیے تھے۔ اس معاہدے کی دفعہ VI میں درج کیا ہوا ہے کہ:

> ''اپنے باہمی دفاع کے مفاد میں حکومت پاکستان حکومت امریکہ سے ایسے اقدامات کرنے میں تعاون کرے گی جن کا مقصد ان ملکوں کے ساتھ تجارت پر کنٹرول کرنا ہے جو امن عالم کے لیے خطرہ ہیں۔'' (۱۵۰)

امن عالم کے لیے کون سے ملک خطرہ ہیں، اس کا فیصلہ امریکہ کرتا ہے، اور اس فیصلہ کے مطابق پاکستان پر کیوبا اور شمالی ویت نام کے ساتھ تجارت کرنے پر پابندی عائد کی گئی تھی۔

پاکستان میں اپنے مال کے لیے منڈی کو مستحکم کرنے کے لیے امریکہ نے پاکستان کی درآمدی پالیسی کو جس طرح سے متاثر کیا گیا ہے وہ بات کسی بھی معاشیات کے طالب علم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ 1964ء میں امریکی دباؤ کی وجہ سے ایوب خان کی حکومت نے درآمدات کی 'فری لسٹ' کا نفاذ کیا جس کی وجہ سے درآمدات پر سے تقریباً سب ہی پابندیاں ہٹ گئیں۔ (۱۵۱) اے۔ آئے۔ ڈی نے اپنے اس کارنامے کا ذکر اپنے ایک دستاویز میں نہایت فخریہ انداز میں کیا ہے (۱۵۲)۔ اور امریکہ کے ایک سرکاری جریدے انٹرنیشنل کامرس نے اس اقدام کو امریکی برآمدی تاجروں کے لیے ایک سنہری موقعہ قرار دیا (۱۵۳)

اس 'فری لسٹ' کی وجہ سے پاکستان میں جس اندھا دھند طریقے سے باہر کا مال درآمد ہونا

شروع ہوا اور جس طرح سے پاکستان کا زرمبادلہ ضائع ہونے لگا، اس کا تجزیہ امریکی ماہر معاشیات اسٹیفن لوئز نے اپنی مختلف تحقیقات میں کیا، جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ:

''معلوم ہوتا ہے کہ فری لسٹ نے جس تیزی کے ساتھ درآمدات میں توسیع کی اس رفتار کے ساتھ مقامی مانگ میں اضافہ نہیں ہوا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مقامی طور پر اشیاء کی قیمتوں میں کمی ہوگئی۔'' (۱۵۴)

1965ء میں جنگ کی وجہ سے جب امریکہ نے اپنی امداد معطل کردی تو پاکستان نے بھی درآمدات کی 'فری لسٹ' کو عارضی طور پر ختم کردیا۔ جنگ کے بعد نہ امریکی امداد پہلے والی مقدار میں بحال ہوئی اور نہ ہی 'فری لسٹ' پر اس آزاد طریقے سے عمل کیا گیا۔ لیکن 1971ء کی جنگ کی وجہ سے پاکستان میں جب اقتصادی بحران اور تیز ہوگیا اور پاکستان نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک سے قرضوں کی ادائیگی میں تاخیر کی اجازت مانگی اور نئے ہنگامی قرضے (Stand-by Loan) کے لیے گزارش کی تو ان دونوں اداروں نے پاکستان کی مجبوریوں سے فائدہ لیتے ہوئے پاکستان سے کئی ایک شرائط منوالیے جن میں درآمدات کی آزادانہ پالیسی بھی شامل تھی جو 'فری لسٹ' سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ اس درآمدی پالیسی کا ذکر بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے رسالے آئے۔ ایم۔ ایف سروے نے اس طرح سے کیا:

''نئی درآمدی پالیسی کے تحت صنعتی ضرورت کے خام مال، فالتو پرزوں اور کل پرزوں کو 330 چیزوں پر مشتمل ایک درآمدی لسٹ پر رکھ لیا گیا ہے جس پر سے تمام موجودہ پابندیاں ہٹادی گئی ہیں اور جن میں سے چند ایک کے علاوہ سب کے لائسنس اب آزادی سے جاری کیے جارہے ہیں۔'' (۱۵۵)

سامراجیوں کے اداروں عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے طرزِ عمل پر ذرا غور کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایسے بے رحم ہیں کہ مفلس کا کشکول بھی چرا کر لے جائیں۔ پاکستان نے ان کے آگے اس لیے ہاتھ پھیلائے کہ اس کے پاس زرمبادلہ نہ تھا، لیکن جب انہوں نے قرضوں کی ادائیگی میں مہلت دی تو اس کے ساتھ ایسی شرائط عائد کردیں کہ جن کی وجہ سے پاکستان کو درآمدات پر بے شمار زرمبادلہ خرچ کرنا پڑے۔ گئے تھے نماز بخشوانے گلے پڑ گئے روزے۔

یک طرف راستہ:

جبکہ سامراجیوں نے اپنے مال کی فروخت کے لیے پاکستان سے ہر قسم کی ناجائز مراعات حاصل کی ہیں، پاکستان کی مصنوعات کو انہوں نے اپنی منڈی میں بکنے کے لیے جائز مواقع بھی فراہم نہیں کیے اور ان پر کوٹا مقرر کرنے کے علاوہ محصولات کی دیوار (Tariff Wall) کھڑی کر دی ہے۔ اس رویہ کی شکایت کرتے ہوئے خود امریکہ نواز صدر ایوب نے لکھا ہے کہ:

> ''امریکہ پاکستان سے اس بات کی توقع کرتا ہے اور اجازت دیتا ہے کہ وہ اس کو ہر سال فقط ڈھائی کروڑ گز کپڑا برآمد کرے، جو ایک مضحکہ خیز حد تک کم مقدار ہے۔ کپڑا ان برآمدات میں سے ہے جن سے پاکستان کو سب سے زیادہ امیدیں وابستہ ہیں، لیکن یہ اصول دیگر اشیاء پر بھی لاگو ہے'' (۱۵۶)

ایوب خان کے اقتدار میں آنے کے بعد درآمدات اس کثرت کے ساتھ بڑھ گئے کہ برآمدات کے مقابلے میں ان کا تناسب تقریباً دوگنا ہو گیا۔ 1965ء کی جنگ کی وجہ سے غیر ملکی قرضوں میں کمی ہو جانے کے ساتھ ساتھ درآمدات میں بھی کمی ہو گئی، اور 1965ء سے 1970ء تک کی مدت میں درآمدات کا تناسب برآمدات سے اوسطاً 54 فیصد زیادہ رہا (۱۵۷)۔ اس وقت پاکستان کے درآمدات، برآمدات سے تقریباً دوگنے ہیں۔

گوشوارہ ۸

پاکستان کے درآمدات اور برآمدات میں منتخب سرمایہ دار ملکوں کا فیصد حصہ

ملک	سال	سال	سال	سال
	1951-56ء	1956-61ء	1961-66ء	1966-71ء	1971-74ء
امریکہ	6.5	23.4	37.9	29.2	24.6
برطانیہ	20.4	17.5	15.4	10.0	7.8

اٹلی	1.4	2.7	2.7	3.9	2.8
مغربی جرمنی	3.2	8.5	11.5	9.8	8.4
جاپان	13.5	6.0	7.9	10.2	4.7
فرنس	1.3	2.6	1.4	2.7	2.1
کل	53.6 46.3	50.6 60.7	39.4 76.8	36.0 65.8	35.4 50.4

Source: 25 Years of Pakistan in Statistics; Pakistan Statistical Yearbook 1974

گوشوارہ نمبر 8 سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے درآمدات زیادہ تر چھ بڑے سرمایہ دار ملکوں سے آتے ہیں جبکہ پاکستان کے برآمدات کی کھپت ان ملکوں میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ تجارت میں عدم توازن کی وجہ سے پاکستان کی مجموعی تجارت میں بہت بڑا خسارہ ہوتا ہے۔

غیر ملکی امداد کس طرح سے پاکستان کی تجارت کو متاثر کرتی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ 1961ء سے لے کر 1965ء تک کی مدت میں پاکستان نے امدادی رقم کے عوض امریکہ سے 71.6 کروڑ ڈالر کا مال درآمد کیا (۱۵۸)۔ جبکہ امریکہ سے پاکستان کی کل درآمدات کی رقم ایک ارب 66 کروڑ 10 لاکھ ڈالر تھی۔ (۱۵۹)

پاکستان کے توازن تجارت کا رجحان یہ رہا ہے کہ اسے سامراجی ملکوں سے سامان درآمد زیادہ کرنا پڑتا ہے لیکن ان کو برآمد کم کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس سوشلسٹ ملکوں اور تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ تجارت میں توازن پاکستان کے حق میں رہتا ہے۔ یعنی ان کا مال خریدنے کے مقابلے میں پاکستان ان کو اپنا مال زیادہ فروخت کرتا ہے۔ جب اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کروائی جاتی ہے تو سرمایہ دارانہ سوچ رکھنے والے ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ یہ ایک فطری عمل ہے کیونکہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں کو پیداواری اجناس کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ سامراجی ملکوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم سامراجی ملکوں سے کرنے والے درآمدات کی ترکیب پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ یہ دلیل کس قدر غلط ہے۔

پاکستان کی کل درآمدات کا 20 فیصد سے بھی کم مشینری پر مشتمل ہے (۱۶۰)۔ یہ بات خاص طور پر امریکی درآمدات کے تجزیہ سے واضح ہوجاتی ہے۔ 1966ء تک امریکی ادارے اے۔ آئے۔ ڈی کے قرضوں سے درآمد کی ہوئی اشیاء کا فقط 18 فیصد ہر قسم کی مشینری (جس میں ریفریجریٹر وغیرہ بھی شامل ہیں) پر مشتمل تھا (۱۶۱)، جبکہ 1968ء سے 1971ء کے درمیان کی مدت میں کل امریکی درآمدات کا ساڑھے بارہ فیصد اس قسم کی مشینری پر مشتمل تھا (دیکھیے گوشوارہ نمبر ۹)۔

گوشوارہ نمبر ۹

پاکستان میں امریکی درآمدات کی فیصد ترکیب، 1968-71ء

درآمدات	کل کا فیصد
لوہا، فولاد اور ان کی مصنوعات	18.2
مشینری	12.5
بناسپتی گھی	10.0
گندم	19.6
موٹر گاڑیاں	7.8
متفرق	31.9
کل	100.0

Source: 25 Years of Pakistan in Statistics

گذشتہ چند سالوں میں پاکستان کے کل درآمدات کا 12 فیصد لوہے، فولاد اور ان کی مصنوعات پر مشتمل تھا، جن میں سے 36 سے 54 فیصد امریکہ سے خریدا گیا تھا (۱۶۲)۔ امریکہ سے درآمد کی ہوئی اشیاء میں ان چیزوں کا تناسب 18 فیصد تھا اور 1966ء تک امریکی اے آئے ڈی کے قرضوں سے خریدی ہوئی اشیاء میں ان درآمدات کا حصہ 41 فیصد تھا (۱۶۳)۔ 1961-63ء سے لے کر 1970-71ء تک کے عرصے میں پاکستان نے امریکہ سے 64.3 کروڑ ڈالر کا لوہا اور فولاد درآمد کیا (۱۶۴)۔ اب یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ امریکہ نے کارخانے

لگانے کی اس شدت کے ساتھ کیوں مخالفت کی اور امریکی دباؤ کی وجہ سے پیش کی ہوئی 'فری لسٹ' میں لوہے اور فولاد کو کیوں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ درحقیقت امریکہ کا پیدا کردہ فولاد اپنی گراں قیمت کی وجہ سے دنیا کے دوسرے ملکوں کے فولاد کا آزاد مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لہذا اپنے امدادی پروگراموں میں شرائط عائد کر کے امریکہ اپنا مہنگا فولاد زبردستی امداد حاصل کرنے والے غریب ملکوں پر تھوپتا ہے۔ امریکی فولاد کے برآمدات کا ایک چوتھائی بیرونی امداد کے بل بوتے پر دوسرے ممالک کو فروخت کیا جاتا ہے (۱۶۵)۔

شرائط تجارت:

اب اس بات کا ہر خاص و عام کو علم ہے کہ سامراجی ملکوں کے زیر تسلط عالمی منڈی میں غریب ملکوں کے خام اور دیگر اشیاء کے دام بہت کم ہیں اور دن بدن گرتے جارہے ہیں یا سست رفتاری کے ساتھ بڑھتے ہیں، جبکہ سامراجی اور صنعتی ملکوں کے مال کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور بہت تیزی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں۔ بیرونی تجارت میں قیمتوں کے اس غیر منصفانہ طرز کی وجہ سے غریب ملکوں کو وہی دام حاصل کرنے کے لیے دن بدن زیادہ سے زیادہ مال درآمد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس امیر ملکوں سے وہی چیز حاصل کرنے کے لیے انہیں دن بدن زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے اور ان کا توازن تجارت دن بہ دن بگڑتا جارہا ہے (۱۶۶)۔ ایک لاطینی امریکی ملک کے باشندے نے بتایا کہ جس پیداوار کے عوض دس سال پہلے وہ سامراجی ملکوں سے تین جیپیں درآمد کر سکتے تھے، اب اس کی جگہ انہیں فقط ایک ہی جیپ مل سکتی ہے۔ درآمدات اور برآمدات کی اضافی قیمتوں کے اس پیمانہ کو شرائط تجارت (Terms of Trade) کہا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ عالمی منڈی میں تجارت کرنے کی وجہ سے پاکستان کے برآمدی مال کی قیمت اس تناسب کے ساتھ نہیں بڑھتی جس رفتار سے پاکستان میں درآمد کیے جانے والے غیر ملکی مال کی۔ 61-1960ء کے مقابلے میں سال 74-1973ء تک پاکستان کے برآمدات کی قیمت میں 243.4 فیصد اضافہ ہوا، جبکہ اس دوران پاکستان کے درآمدات کی قیمت میں 258.6 فیصد اضافہ ہوا، اور اس طرح سے پاکستان کی بین الاقوامی قوت خرید 4.2 فیصد گھٹ گئی (۱۶۷)۔ جب تک

پاکستان کی برآمدات میں بنگلہ کاپٹسن بھی شامل تھی اس وقت پاکستان کے لیے شرائط تجارت اور بھی غیر منصفانہ تھے۔ عین ممکن ہے کہ سرکاری اعداد و شمار تجارت کے ذریعے پاکستان کی حقیقی لوٹ کھسوٹ کی صحیح ترجمانی نہ کر رہے ہوں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ مختلف سرکاری مطبوعات میں مختلف اوقات پر تجارتی قیمتوں کے متعلق مختلف اعداد و شمار پیش کیے گئے تھے۔

سامراجی ملکوں نے عالمی منڈی پر اپنے قبضہ کی وجہ سے اپنی مصنوعات کی قیمتیں جس طرح سے بڑھا رکھی ہیں وہ بات تو اپنی جگہ پر ہے، لیکن جب یہ کسی غریب ملک کو امدادی قرضے دیتے ہیں تو اس وقت ان پر یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ وہ یہ رقم ان کا مال درآمد کرنے پر خرچ کریں، اور اکثر اوقات اس مال کی قیمت وہ عالمی منڈی کے داموں سے بھی اونچی رکھتے ہیں۔ پاکستان نے مشروط ادھار (Tied Credits) کے عوض جو مال درآمد کیا ہے اس پر اُسے اسی قسم کے غیر واجبی دام ادا کرنے پڑے ہیں۔ پاکستان کی منصوبہ بندی کمیشن کے سابق اعلیٰ ماہر معاشیات ڈاکٹر محبوب الحق نے منصوبہ جاتی (project) اور غیر منصوبہ جاتی امداد (Non-ProjectAssistance) کے تحت مشروط ادھار پر منگوائے ہوئے مال کی قیمتوں کا تجزیہ کیا (۱۶۸)۔ جو منصوبے عمل میں لائے گئے ان میں سے بعض میں، مثلاً بلوچستان کے کوئلے کی کانوں کے منصوبہ میں، فرانسیسی قرضے پر منگوائے ہوئے مال پر عالمی منڈی کے دام کے مقابلے میں پاکستان کو دوگنی قیمتیں ادا کرنی پڑیں دوسرے منصوبوں میں جہاں بہت زیادہ قیمتیں طلب کی گئیں لیکن ادا نہیں کی گئیں ان کی چند مثالیں یہ ہیں:

بلوچستان کی کانوں کے لیے ہوا کی نالیاں	فرانسیسی قرضہ	392 فیصد زائد قیمت
دیہاتی بجلی منصوبہ	اٹلی کا قرضہ	240 فیصد زائد قیمت
کراچی شپ یارڈ	برطانوی قرضہ	317 فیصد زائد قیمت

غیر منصوبہ جاتی قرضوں کے تحت پاکستان نے امریکہ سے ریل گاڑیوں کے لیے پہیوں اور ایکسل کا سامان درآمد کیا جس پر اُس نے 157 فیصد زائد قیمتیں ادا کیں۔ محبوب الحق صاحب کا کہنا ہے کہ مجموعی طور پر مشروط ادھار کی وجہ سے پاکستان کے درآمدات کی قیمت اوسطاً 12 فیصد بڑھ جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ پاکستان کو اس لوٹ مار کا عادی

ہوجانا چاہیے۔ایک غیر ملکی ماہر معاشیات شینیری (Chenery) کا خیال ہے کہ محبوب الحق نے زائد قیمتوں کا کم تخمینہ لگایا ہے، اور درحقیقت مشروط ادھار کی وجہ سے فوقیات میں تبدیلی آجانے کے اخراجات اور مشروط ادھار کے اثرات کو مٹانے کے لیے انتظامی صلاحیتوں کے ضائع ہونے کے معاوضے کو بھی زیادہ قیمت میں شامل کرنا چاہیے (۱۶۹)۔

مشروط قرضوں کی وجہ سے درآمدی مال پر جو زائد قیمت ادا کی جاتی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے امریکہ کی مشہور ''امدادی'' اجناس لوہے اور فولاد کے داموں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پاکستان کی منصوبہ بندی کمیشن کی تحقیق کے مطابق 1967ء میں امریکہ سے درآمد کی ہوئی لوہے اور فولاد کی مختلف اجناس پر 41 فیصد سے لے کر 111 فیصد تک زائد قیمت ادا کی گئی (دیکھئے گوشوارہ نمبر 10)۔ پاکستان میں جس بھاری مقدار میں امریکی فولاد درآمد کیا گیا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان قیمتوں کی وجہ سے پاکستان کو کتنا لوٹا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱۰

مشروط ادھار پر منگوائی ہوئی فولادی مصنوعات پر زائد قیمت کی وصولی

جنس	زائد قیمت (فیصد)
ایم۔ایس بلیٹز	91
ایم ایس بلیٹز	72
ایم ایس اسٹرپز	44
سٹرکچرل (چینل)	68
جی پی شیٹز	44
جی سی شیٹز	41
تار (6 ملی میٹر)	111
تار (6 S.W.g)	97

Source: Irving Brecher and S.A. Abass, Foreign Aid in Pakistan, London : Cambridge University Press, 1972

گوشوارہ نمبر ۱۱

امریکی گندم کی عالمی منڈی میں اور پاکستان کے لیے قیمت ڈالر فی ٹن

سال	عالمی منڈی میں قیمت	پاکستان کے لیے "امدادی" قیمت
1965-66	53.00	58.70
1966-67	61.00	67.00
1967-68	56.66	67.95
1968-69	57.00	66.14
1969-70	48.33	52.10
1970-71	55.00	59.14

Source: Pakistan Yearbook 1971, Karachi: National Publishing House, 1971; Pakistan Economic Survey 1970-71; Production Yearbook 1971, Rome: FAO, 1972

اسی طرح پی ایل 480 کے تحت درآمد کی ہوئی امریکی گندم کی قیمتوں میں بھی غیر مناسب قسم کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ گوشوارہ نمبر 11 میں امدادی پروگرام کے تحت پاکستان کو فروخت کی ہوئی گندم کے داموں کا امریکی گندم کی عالمی منڈی میں قیمتوں کے ساتھ مقابلہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت خود عالمی منڈی میں اکثر سالوں میں آسٹریلیا کی گندم کے دام امریکی گندم کے دام سے کم تھے (۱۷۰)۔ لیکن اگر ہم مشروط قرضوں پر دی ہوئی امریکی گندم کی قیمت کا فقط امریکی گندم کی برآمدی قیمت سے ہی مقابلہ کر کے زائد قیمت کا تخمینہ لگائیں تو یہ نظر آئے گا کہ 1965ء سے لے کر 1970ء کی مدت میں پاکستان نے امریکہ کو ساڑھے پانچ کروڑ ڈالر زیادہ ادا کیے (۱۷۱)۔ مزید یہ کہ عالمی منڈی میں گندم کی مانگ میں لچک (Demand Elasticitices) کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اگر امریکہ پاکستان اور دوسرے ملکوں کو اگر یہ گندم امداد کے بہانے زیادہ قیمت میں فروخت نہیں کرتا تو وہ کم از کم اسے عالمی منڈی کے بھاؤ پر تو فروخت کر ہی لیتا۔ ماہر معاشیات

پنکس (Pincus) نے تخمینہ لگایا ہے کہ 1961ء اور 1962ء میں پی۔ایل 480 کی گندم کی قیمت برآمدی قیمت سے 30 فیصد کم رہتی، اور اس قیمت پر بھی اس گندم کا 1961ء میں فقط 53 فیصد اور 1962ء میں 66 فیصد عالمی منڈی میں بک سکتا۔ باقی گندم کی قیمت صفر ہے (۱۷۲)۔

لوٹ مار کی داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ پی ایل 480 اور دیگر مشروط قرضوں کے تحت فروخت کی ہوئی اکثر امریکی اشیاء کے ساتھ یہ بھی پابندی لگائی جاتی ہے کہ انہیں امریکی جہازوں میں لاد کر پاکستان لایا جائے، جبکہ امریکی بندرگاہوں سے پاکستانی جہاز اکثر خالی لوٹ کر جاتے ہیں۔ گندم کی منتقلی میں امریکی جہازوں نے دوسرے جہازوں کے مقابلے میں پاکستان سے تقریباً دوگنا کرایہ وصول کیا ہے (۱۷۳)۔ اس طرح سے ایک ٹن کی درآمدی قیمت میں 12 سے 14 ڈالر کا اضافہ ہوگیا۔

اے۔آئے۔ڈی اور برآمدی درآمدی بینک کے قرضوں سے خریدے ہوئے ریل گاڑیوں کے انجنوں پر جہاز کا کرایہ 13 فیصد زیادہ لیا گیا (۱۷۴)۔ اس قسم کے جن چار واقعات کا ذکر محبوب الحق صاحب نے کیا ہے ان میں پاکستان سے کل 61,300, 4 ڈالر زیادہ وصول کیے گئے۔ مکمل معلومات کی عدم موجودگی میں اس قسم کی لوٹ مار کا صحیح اندازہ لگانا ناممکن ہے، لیکن ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امداد کے بہانے سامراجی ملک غریب ملکوں کا ہر ممکن طریقے سے استحصال کرتے ہیں اور ان کی مجبوریوں سے پورا پورا فائدہ لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا جائزے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عالمی منڈی میں جکڑے رہنے کی وجہ سے اور خاص طور پر غیر ملکی امداد کی شرائط کے تحت تجارت کرنے کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کو کس قدر نقصان پہنچ رہا ہے اور ملک کی دولت کو کس بری طرح سے لوٹا جارہا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ یہ لوٹ مار سامراجی تن تنہا نہیں کرسکتے۔ ان کے ساتھ مقامی دلال تاجروں کا وہ طبقہ بھی شریک ہے جس کا مفاد سامراجی مفاد کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جو اندھی دولت کمانے کی خاطر ملک کی مجموعی دولت اور ملک کے مقدر کا نیلام کرنے کے لیے تیار ہیں۔

ساتواں باب

نئی راہیں، نئی ٹھوکریں

پاکستانی تارکین وطن مرکز اسلام سعودی عرب کی خدمت کرنے کے لیے بہت مشتاق ہیں۔ وہ زیادہ اجرت کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں، کام زیادہ کرتے ہیں اور ان کو جو کام سونپا جاتا ہے اس کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنی بہترین صلاحیتیں لگا دیتے ہیں۔'' ریاض الخطیب، پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر، ڈان، 23 ستمبر 1976ء

سامراجی ملکوں کی سرپرستی کے تحت پاکستان میں جس قسم کی معاشی 'ترقی' ہوئی، اس سے پاکستان کے مسائل حل ہونے کی بجائے اور بھی سنگین ہوتے گئے۔ چند سرمایہ داروں، زمینداروں، سرکاری افسروں اور فوجی جرنیلوں، کرنلوں کے ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز ہونے کی وجہ سے محنت کشوں اور درمیانے طبقے کے ایک حصے کے معاشی حالات دن بدن خراب ہوتے گئے۔ عوام اور حکمرانوں کے درمیان اور حکمران طبقے کے مختلف گروہوں کے درمیان تضادات کی شدت اس حد تک بڑھ گئی کہ مفلوج سرمایہ داری کے چوکیدار ایوب خان کی دس سالہ آمریت عوام کی پانچ مہینے لمبی احتجاجی مہم کا مقابلہ نہ کر سکی اور 1969ء میں ایوب خان کو اقتدار سے دست بردار ہونا پڑا۔ ایوب خان کے جانے کے ساتھ ان کی سرمایہ دارانہ جنت کا خواب بھی مٹی میں مل گیا۔ پاکستان کا معاشی بحران اس قدر گہرا ہو گیا کہ مالی سال 70-1969ء سے لے کر مالی سال 71-1970ء تک ملک کی فی کس پیداوار میں 3.1 فیصد کمی اور اس کے اگلے سال 1.5 فیصد کمی واقع ہوئی (۱۵۷)۔ سامراجی ممالک، جو کہ اب خود ایک معاشی بحران سے دوچار تھے، پاکستان کی خاطر خواہ امداد کرنے کے لیے

رضامند نہیں تھے۔ پاکستان کو مجبور ہو کر متبادل مالی ذرائع کی تلاش شروع کرنا پڑی اور مشرق وسطی میں اپنے مال اور ہنرمندوں کے لیے منڈی وسیع کرنے کی خاطر اور مسلم ممالک سے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے تگ و دو شروع کرنا پڑی۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پالیسی کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے، پاکستان کا بحران سنگین صورت اختیار کر گیا اور 1971ء میں بھارت کے ساتھ جنگ اور بنگلہ دیش کی آزادی کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کو شدید نقصان پہنچا۔ دیگر نقصانات کے علاوہ مشرقی بنگال کی وہ منڈی بھی چھن گئی جس میں سالانہ مغربی پاکستان کا ڈیڑھ ارب روپیہ کا مال فروخت کیا جاتا تھا (۱۷۶)۔ پاکستان کے سرکاری (خاص طور پر فوجی) اور ترقیاتی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے پاکستان کو نئے مالی ذرائع کی شدید ضرورت تھی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے پاکستان نے ایک طرف تو سامراجی ممالک کی طرف رجوع کیا، اور دوسری جانب اس نے مشرق وسطی کے ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں تیل کی بین الاقوامی قیمتوں میں اچانک غیر معمولی اضافے ہو جانے سے ایک طرف سامراجی ممالک کے توازن ادائیگی پر برا اثر پڑا تو دوسری طرف تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک میں بے پایاں دولت کا ارتکاز شروع ہو گیا۔ اس نئے دولت کی وجہ سے ایران، سعودی عرب، کویت، ابوظہبی، دبئی، عمان اور دیگر عرب ممالک میں معاشی ترقیاتی اور غیر ترقیاتی سرگرمی تیزی کے ساتھ بڑھ گئی اور اشیائے صرف اور ہنرمندوں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ یہ پاکستان کے لیے ایک سنہری موقع تھا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے اپنی پالیسیوں میں ضروری تبدیلیاں لا کر تیزی کے ساتھ زرمبادلہ کمانے کی کوشش کی۔

گذشتہ چند سالوں میں پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کے درمیان اقتصادی تعلقات بہت مستحکم ہوئے ہیں اور پاکستان کے اقتصادی رجحانات میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے مظاہر سے عام تاثر یہ ملتا ہے کہ پاکستان کی معیشت پہلے کے مقابلے میں مضبوط ہو گئی ہے اور سامراجی ممالک پر انحصار کم ہو گیا ہے۔ یہ معاملہ گہری سوچ اور تجزیہ کا محتاج ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم پاکستان اور مسلم ممالک کے درمیان باہمی اقتصادی تعاون اور تعلقات سے متعلق چیدہ چیدہ حقائق یہاں بیان کریں اور حال میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کریں۔

مال کی تجارت:

گذشتہ چند سالوں میں پاکستان کی برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ بنگلہ دیش کی علیحدگی سے پہلے غیر منقسم پاکستان کے کل برآمدات کی سالانہ مالیت تقریباً پونے دو ارب روپے تھی، لیکن پچھلے تین سالوں میں پاکستان نے برآمدات کے ذریعے سالانہ دس ارب روپے سے بھی زیادہ کمایا ہے (۱۷۷)۔ اس اضافے کی ایک وجہ پاکستان کے روپے کی قیمت میں کمی ہے، یعنی پہلے جو چیز ایک ڈالر میں بکتی تھی اس کے تقریباً پانچ روپے دکھائے جاتے تھے جبکہ اب تقریباً دس روپے دکھائے جاتے ہیں۔ دوسری وجہ عام افراط زر ہے جس کی وجہ سے پاکستان کی چند اجناس کی قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں۔ لیکن ایک تیسری اور اہم وجہ مسلم ممالک کے ساتھ تجارت میں اضافہ ہے۔ مالی سال 70-1969ء میں پاکستان کی مجموعی برآمدات میں ایران، عراق، ابوظہبی، دبئی، کویت، عمان، سعودی عرب، لیبیا اور انڈونیشیا کا حصہ فقط 6.6 تھا، لیکن 74-1973ء تک ان کا تناسب بڑھ کر 24.8 فیصد ہو گیا (۱۷۸)۔ پاکستان کے کل برآمدات میں مشرق وسطی کا حصہ 74-1973ء میں 18.6 فیصد تھا، لیکن 75-1974ء میں یہ بڑھ کر 29.2 فیصد ہو گیا اور 76-1975ء کے پہلے نو مہینوں میں یہ تناسب 26 فیصد تھا (۱۷۹)۔ 71-1970ء میں پاکستانی مال کے خریداروں میں سعودی عرب کا نمبر سترہ تھا لیکن 75-1974ء میں اس کا نمبر چار ہو گیا اور اسی طرح ایران پچیسویں نمبر سے بڑھ کر پانچویں نمبر پر پہنچ گیا (۱۸۰)۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کے برآمدات میں سامراجی خریداروں کا تناسب گھٹ گیا۔ گوشوارہ نمبر ۸ میں پہلے ہی درج ہے کہ چھ بڑے سرمایہ دار ملکوں، یعنی امریکہ، جرمنی، جاپان، فرانس، برطانیہ اور اٹلی میں پاکستانی مال کے لیے منڈی دن بدن تنگ ہوتی گئی تھی، حتی کہ مالی سال 75-1974ء میں ان چھ ملکوں نے پاکستان کی برآمدات کا فقط 26 فیصد خریدا (۱۸۱)۔

ہنرمندوں اور محنت کشوں کی تجارت:

"چلتے ہو تو دبئی کو چلیے" آج کل پاکستان میں عام رجحان ہے۔ بیروزگاری اور کم تنخواہوں کی وجہ سے پاکستان کے ہزاروں ہنرمند اور محنت کش دبئی، ابوظہبی، عمان اور دوسرے ملکوں کی طرف

کوچ کر رہے ہیں۔ بیورو آف امیگریشن کے اعداد و شمار کے مطابق 1970ء سے لے کر 1975ء تک کے ستمبر تک، 55 ہزار 546 افراد نے خلیج کے ممالک میں ملازمت اختیار کی اور فقط سال 1974ء میں ہی ان کی تعداد 16328 تھی (۱۸۲)۔ وزیر مملکت برائے محنت ستار گبول نے انکشاف کیا ہے کہ ہر سال سولہ ہزار افراد قانونی طور پر ملازمت کے لیے پاکستان سے باہر جاتے ہیں جبکہ 84 ہزار افراد غیر قانونی طور پر باہر چلے جاتے ہیں۔ اس طرح سے بیرون ملک ملازمت کے لیے باہر جانے والوں کی کل سالانہ تعداد ایک لاکھ ہے (۱۸۳)۔ قانونی طور پر باہر جانے والوں کی تعداد کا تخمینہ یقیناً کم لگایا گیا ہے۔ کراچی میں سعودی عرب کے کونسل خانے کے اعداد و شمار کے مطابق اس ہجری سال کے پہلے نو مہینوں میں 75,000 ویزے جاری کیے گئے جن میں حج کے ویزے شامل نہیں ہیں (۱۸۴)۔ تو یہ حال ہے فقط ایک ملک کے ایک کونسل خانے کا۔

تارکین وطن کی طرف سے اپنے گھر والوں کو روپیہ ارسال کرنے کی وجہ سے پاکستان میں آنے والے زرمبادلہ کی مقدار میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ان کے بھیجے ہوئے زرمبادلہ کی اہمیت کا اندازہ گوشوارہ نمبر 12 سے ہو سکتا ہے۔ (تقابلی مطالعے کی خاطر تارکین وطن کے بھیجے ہوئے زرمبادلہ کے اعداد و شمار میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ہم نے سال 71-1970ء اور 72-1971ء میں تارکین وطن کے بھیجے ہوئے زرمبادلہ کا نرخ ایک ڈالر برابر نو روپے نوے پیسے لگایا ہے جبکہ حقیقی نرخ پونے پانچ تھا۔ اس لیے ان دو سالوں کے لیے ہم نے تارکین وطن کے بھیجے ہوئے زرمبادلہ اور پاکستان کی کل برآمداتی کمائی کے تناسب کا حساب نہیں لگایا ہے) اس گوشوارے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تارکین وطن کا بھیجا ہوا روپیہ نہ فقط پچھلے پانچ سالوں میں تقریباً پانچ گنا بڑھ گیا ہے بلکہ برآمداتی اجناس کے مقابلے میں اس کی قدر دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس وقت جبکہ پاکستان سالانہ تین ارب روپے سے زیادہ تارکین وطن کے ارسال کیے ہوئے زرمبادلہ سے کما رہا ہے، برآمدات کے ذریعے کمائے ہوئے کل زرمبادلہ کی رقم تقریباً دس ارب روپے ہے۔ تارکین وطن کے ارسال کیے ہوئے زرمبادلہ کے مقابلے میں پاکستان کے اولین برآمدی مال چاول کے ذریعے کمائے ہوئے زرمبادلہ کی رقم آدھی سے تھوڑی زیادہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کی اولین برآمدی جنس افرادی قوت ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱۲

پاکستان کے کمائے ہوئے زرمبادلہ کی ترکیب (کروڑ روپئوں میں)

ذریعہ	1970-71	1971-72	1972-73	1973-74	1974-75	1975-76 جولائی مارچ
تارکین وطن کا ارسال کیا ہوا	68.21	95.34	144.84	149.69	227.60	320.76
برآمدات (کل)	199.84	337.14	855.12	1016.12	1028.63	809.69
خام کپاس	27.00	95.48	116.70	37.61	154.39	87.15
سوتی دھاگا	34.42	59.23	194.10	181.06	85.14	104.89
سوتی کپڑا	13.13	38.71	124.71	141.68	131.25	91.59
چاول	17.30	27.41	113.61	209.85	230.37	169.58
اور2 کا تناسب	--	--	16.94	14.73	22.13	--

Source: Pakistan Economic Survey 1975-76

قرضے اور سرمایہ کاری:

مالی سال 75-1974ء سے پہلے پاکستان کو دیگر مسلم ممالک کی طرف سے فقط دو قرضے ملے تھے۔ ان میں سے ایک 50 لاکھ ڈالر کی رقم 70-1969ء میں کویت کی طرف سے اور دوسرا تین کروڑ ڈالر کا قرضہ لیبیا کی طرف سے 74-1973ء میں وصول ہوا تھا (۱۸۵)۔ لیکن 75-1974ء سے تیل برآمد کرنے والے (اوپیک) ممالک نے بیرونی امداد کا ایک وسیع پروگرام شروع کر دیا اور غریب ملکوں کو دی جانے والی قرضہ جاتی رقم میں سامراجی ملکوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ ان کے

قرضوں سے مستفید ہونے والے ملکوں میں پاکستان اور مصر پیش پیش تھے۔ اُس سال پاکستان کو کل ایک ارب ساڑھے تیرہ کروڑ ڈالر کے قرضے وصول ہوئے، جن میں سے 41 کروڑ ڈالر، یعنی 36 فیصد، تیل برآمد کرنے والے مسلم ممالک سے حاصل ہوئے (۱۸۶)۔ مالی سال 76-1975ء کے تخمینہ کے مطابق وصول کردہ قرضے کی کل رقم ایک ارب 24 کروڑ 15 لاکھ ڈالر ہوگی، جن میں سے 38 کروڑ 62 لاکھ ڈالر اوپیک کے مسلم ممالک سے حاصل ہوں گے۔

پاکستان کو قرضے دینے والے مسلم ممالک میں ایران، سرِفہرست ہے جس نے اولاً تین سال کی مدت میں 58 کروڑ ڈالر کے قرضے دینے کا معاہدہ کیا اور بعد میں مزید چار کروڑ 89 لاکھ ڈالر دینے کا معاہدہ کیا۔ جن عرب ملکوں نے پاکستان کو قرضے دیے ہیں یا دینے کے لیے معاہدے کیے ہیں ان کے نام اور رقمیں حسبِ ذیل ہیں (۱۸۷)۔

لیبیا	8 کروڑ ڈالر
سعودی عرب	13 کروڑ ڈالر
ابوظہبی	10 کروڑ ڈالر
قطر	1 کروڑ ڈالر

اس کے علاوہ بعض مسلم ملکوں نے پاکستان میں سرمایہ کاری کرنا شروع کردی ہے۔ ابوظہبی، ایران، لیبیا، سعودی عرب اور کویت نے اب تک پاکستان میں 39 کروڑ 10 لاکھ ڈالر کا سرمایہ لگانے کا وعدہ کیا ہے (۱۸۸)۔ پاکستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے میدان میں بھی اب یہ ملک سامراجی ملکوں کو پیچھے چھوڑتے جارہے ہیں۔

تکنیکی تعاون:

خلیج کے ملکوں میں اپنے ہنرمند اور محنت کش برآمد کرنے کے علاوہ پاکستان ان ممالک کو مختصر یا طویل مدت کے لیے مشیر مہیا کرتا ہے، ان کے عملے کو تکنیکی تربیت فراہم کرتا ہے اور ان کے لیے ٹھیکے پر کام کرتا ہے۔ سعودی عرب کے مالیاتی ادارے کے سابق سربراہ انوار علی مرحوم ایک پاکستانی تھے۔ اس طرح ابوظہبی کی سرمایہ کاری کی کارپوریشن کے موجودہ سربراہ نظیرالدین محمود بھی ایک پاکستانی ہیں۔ ان کے علاوہ خلیج کے مختلف ملکوں میں متعدد پاکستانی اقتصادی اور دیگر معاملات

میں اہم کردار انجام دے رہے ہیں۔ خود پاکستان کے اندر خلیج کے ملکوں کے لوگوں کو مختلف ہنر سکھانے کے لیے تربیت دی جارہی ہے۔ جس کی ایک مثال سعودی عرب کے لوگوں کو سیمنٹ کے کارخانے چلانے کی تربیت دینا ہے۔

ایران اور خلیج کے عرب ملکوں کی طرف سے پاکستان کو مختلف ٹھیکے دیے گئے ہیں۔ نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کو ابوظہبی میں سڑکیں اور عمارتیں تعمیر کرنے کے لیے تین کروڑ ڈالر کا ٹھیکہ ملا ہوا ہے(۱۸۹)۔ اسی کمپنی کو اب سعودی عرب میں بھی تعمیرات کا بہت بڑا ٹھیکہ ملا ہے۔ کراچی شپ یارڈ نے حال میں ابوظہبی کو 70 لاکھ ڈالر میں ایک جہاز بنا کر دیا ہے(۱۹۰)۔ اور اسے ایران کی طرف سے 19 بارجین بنانے کے لیے تین کروڑ 75 لاکھ ڈالر کا ٹھیکہ ملا ہوا ہے(۱۹۱)۔ پی آئی اے کو بھی ابوظہبی کی طرف سے فضائی کمپنی قائم کرنے کے لیے ساڑھے تین کروڑ ڈالر کے ٹھیکے کی توقع ہے(۱۹۲)۔

فوجی معاملات میں تکنیکی تعاون خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ابوظہبی کی فضائی فوج قائم کرنے کے لیے پاکستان کو ٹھیکہ دیا گیا ہے۔ پاکستانی افسر ابوظہبی کے نوجوانوں کو نہ صرف فوجی تربیت دیتے ہیں، بلکہ جنگی سامان کی خرید اور فضائیہ کے تنظیمی ڈھانچے کو قائم کرنے کی ذمہ داری بھی پاکستانیوں پر ہے۔ عمان، سعودی عرب اور کویت کی افواج میں بھی پاکستانی اہم پوزیشن پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ عمان کی فوج کے بیشتر سپاہی پاکستان سے ہی بھرتی کیے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا سرگرمیوں کی وجہ سے پاکستان کو اچھا خاصا زرمبادلہ حاصل ہوجاتا ہے جس کا بیشتر حصہ تارکین وطن کے ارسال کیے ہوئے روپے یا برآمدات کے ذریعے کمائے ہوئے زرمبادلہ سے متعلق اعداد و شمار میں شامل نہیں کیا جاتا۔

پاکستان کی معیشت کو تیل برآمد کرنے والے ملکوں کی معیشت کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے کئی ادارتی اقدامات کیے گئے ہیں۔ ایران، لیبیا، سعودی عرب اور دیگر ممالک کے ساتھ مشترکہ وزارتی کمیشن قائم کیے گئے ہیں تاکہ باہمی اقتصادی امور پر تبادلہ خیال، فیصلے اور نگرانی کی جاسکے۔ اس کے علاوہ لیبیا کے ساتھ مشترکہ سرمایہ کاری کمپنی، مشترکہ ایوان تجارت اور مشترکہ بینکنگ کارپوریشن اور عمان اور سعودی عرب کے ساتھ مشترکہ سرمایہ کاری بینکیں قائم کی گئی ہیں۔

پاکستان کے لیے نتائج:

تیل برآمد کرنے والے مسلم ممالک کے ساتھ پاکستان کے اقتصادی تعلقات مستحکم ہونے کی وجہ سے بظاہر پاکستان کے زرمبادلہ کی صورت حال بہتر ہوئی ہے اور لاکھوں لوگوں کو روزگار مہیا ہوا ہے۔ لیکن کسی بھی اقتصادی پالیسی یا انتظام کے اثرات کی بابت فیصلہ فوری یا سطحی نتائج کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ مسلم ممالک کے ساتھ بڑھتے ہوئے اقتصادی تعلقات کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے ان تعلقات کے مختلف پہلوؤں کا گہرا تجزیہ کرنا ضروری ہے اور یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ بظاہر جو فائدہ ہو رہا ہے ملک کو اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

سب سے پہلے تجارت کو ہی لے لیجئے۔ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کو پاکستان جو اشیاء برآمد کرتا ہے ان میں سیمنٹ اور چاول سرفہرست ہیں، گذشتہ تین سالوں میں مختلف عرب ملکوں کو برآمد ہونے والے مال میں ان دو اجناس کا تناسب حسبِ ذیل تھا (۱۹۳)۔

ابوظہبی	61 سے 68 فیصد
دوبئی	65 سے 66 فیصد
کویت	37 سے 86 فیصد
سعودی عرب	20 سے 56 فیصد

ایک ترقی پذیر اور بھوکے ملک سے ان دو اشیاء کی بھاری مقدار میں برآمد کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ پاکستان جیسے ملک کو اپنے تعمیراتی پروگراموں کے لیے سیمنٹ کی سخت ضرورت ہے۔ اپنی پیداوار کا تقریباً ایک چوتھائی سیمنٹ باہر ملکوں میں بیچ دینے کی وجہ سے مقامی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ اور بلیک مارکیٹنگ ہوئی ہے، رہائشی مکانوں کی تعمیر کے اخراجات بڑھ گئے ہیں اور تعمیراتی کام بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اسی طرح چاول کی برآمد کے لیے خصوصی کارپوریشن قائم کرنے کی وجہ سے وسیع پیمانے پر نئے انتظامی اخراجات پیدا ہو گئے ہیں اور دھاندلی بازی کا بازار گرم ہو گیا ہے۔ اگر ان اخراجات، دھاندلی بازی اور مال کے ذائع ہونے کا صحیح تخمینہ لگایا جائے تو چاول کے کاروبار میں پاکستان کو نفع نہیں بلکہ نقصان ہوا ہے، جبکہ عوام کو اس اہم غذا سے محروم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پھلوں اور سبزیوں کے برآمد ہونے کی وجہ سے ان کے دام آسمان

سے باتیں کرنے لگے ہیں اور اکثر اوقات پیاز اور آلو بھی عام آدمی کی قوتِ خرید سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اچھے کِقو، مالٹا اکثر ایران کو برآمد ہو جاتے ہیں اور مقامی بازار میں زیادہ تر ردّی مال ہی دستیاب ہوتا ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کی برآمد کی وجہ سے پاکستان کے لوگوں میں وٹامن یا حیاتین کی مزید کمی ہو جانے کا خطرہ ہے۔

پاکستان دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں گوشت، مچھلی اور دیگر لحمیات کا استعمال صحت کے لیے مقرر کردہ کم از کم حد سے بھی بہت کم ہے۔ یہاں حیوانی لحمیات کا اوسط استعمال روزانہ ۱۰ گرام فی شخص سے بھی کم ہے، جبکہ اسے تقریباً ۴۰ گرام ہونا چاہیے۔ ایک طرف تو اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے کوئی بھی خاطر خواہ اقدام نہیں اٹھایا جاتا تو دوسری طرف خلیج کے ملکوں کو اندھا دھند گوشت فروخت کیا جاتا ہے۔ وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے گوشت کی برآمد پر پابندی لگا دی جاتی ہے لیکن ایران اور خلیج کے ملکوں کو مویشیوں کی اسمگلنگ بدستور جاری رہتی ہے۔ ان ممالک میں دولت کی افراط اور مویشیوں کی کمی کی وجہ سے پاکستان کے منافع خوروں کے لیے مستقل کشش پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو گوشت سے محروم کر کے خلیج کے ممالک کو مال برآمد کرتے رہیں۔

کراچی میں مچھلی بندر قائم ہونے کی وجہ سے پہلے ہی کراچی اور ساحل مکران کے لوگوں کے لیے مچھلی گراں قیمت ہو گئی تھی، لیکن اب ساحل مکران سے پکڑی جانے والی زیادہ تر مچھلی سمندر میں ہی ایرانیوں کو فروخت کر دی جاتی ہے۔ اس تجارت کی وجہ سے گوادر، پسنی، اور مار اور دیگر مقامات پر مچھلی تقریباً ناپید ہو گئی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱۳

سرکاری ذرائع سے بیرون ملک ملازمت کرنے والوں کے منتخب پیشے اور تعداد

1971-75

پیشہ	تعداد
انجینئر	753
ڈاکٹر	1269

نرسیں	117
استاد	394
ویلڈر	562
راج	4608
بڑھئی	4016
الیکٹریشن	1859
پلمبر	1008
مکینک	1496
تکنیکی ہنرمند (متفرق)	2914
مزدور	8218

Source: Bureau of Emigration, mimeographed tables.

پاکستان سے خلیج کو برآمد ہونے والی بیشتر اشیاء ایسی ہیں جو خود پاکستان کے عوام کی روزمرہ زندگی اور ملک کی ترقی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی تجارت ملک کو نقصان ہی پہنچا سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ سنگین بات یہ ہے کہ خود پیداوار کے خالقوں کو برآمد کر دیا جائے۔ پاکستان سے بیرون ملک روزگار کے لیے جانے والوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں عام مزدوری کرنے والوں کے علاوہ ہنرمند بڑھیوں، پلمبروں، راجوں، الیکٹریشنوں، ڈاکٹروں اور انجینئروں کی بڑی تعداد شامل ہے (دیکھیے گوشوارہ نمبر 13)۔ افرادی قوت کی اس تجارت میں ملک کی ضروریات کا قطعی خیال نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک سرکاری تحقیقی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ 1973ء میں برآمد کے لیے فقط 76 فاضل راج میسر ہوں گے (۱۹۴)۔ لیکن پھر بھی سرکاری ذریعے سے اسی سال 912 اور 1974ء میں 1166 راج خلیج کو روانہ کیے گئے (۱۹۵)۔

پاکستان میں اوسطاً سات ہزار افراد پر فقط ایک ڈاکٹر ہے۔ ہر سال تقریباً ایک ہزار نئے ڈاکٹر تیار ہوتے ہیں، لیکن خود سرکاری ذرائع کے مطابق کم از کم پونے چار سو ڈاکٹر ہر سال پاکستان

چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں (۱۹۶)۔

ان ہنر مند افراد کے نقل وطن کے اثرات فوری طور پر محسوس ہو رہے ہیں، خاص طور پر مکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں جہاں راجوں، بڑھیوں اور پلمبروں کی کمی کی وجہ سے مکان بنانے کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں اور تعمیرات کا معیار بہت گھٹ گیا ہے۔ درحقیقت اس رجحان کے اثرات ملک کی ترقی کے لیے بہت دُور رَس اور خطرناک ہیں کیونکہ اس بھاری تعداد میں ہنرمندوں کے باہر جانے کی وجہ سے ملک کی ترقی کی بنیاد کھوکھلی ہوتی جا رہی ہے۔ جلد اور آسان طریقے سے زرمبادلہ کمانے کی خاطر اپنے ہنرمندوں کی تجارت کرنا کسی ملک کے لیے ایسا ہی ہے جیسا ایک تاجر کا اپنی پونجی میں کھانا۔ وہ ایسا فقط اس وقت کرتا ہے جب اس کا دھندا ٹھپ ہو جاتا ہے اور وہ دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ افرادی قوت کی تجارت ملک کے اقتصادی دیوالیہ پن کی عکاسی کرتی ہے اور ملک کی بنیادی تعمیر کے کام سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔ اس بات کا احساس غالباً حکومت کے ان عناصر کو بھی تھا جنہوں نے جلد بازی میں ہنرمندوں کے نقل وطن کے خلاف جنوری 1976ء میں ایک آرڈیننس نافذ کروا دیا۔ لیکن اس وقت تک اتنے سارے لوگوں کے مفادات اس پالیسی کے ساتھ وابستہ ہو چکے تھے کہ ان کے دباؤ کی وجہ سے یہ قانون فوری طور پر منسوخ کرنا پڑا۔

تارکین وطن کی طرف سے سالانہ تین ارب روپیہ ارسال ہونے کی وجہ سے ملک میں افراطِ زر کی صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی ہے۔ یہ روپیہ باہر کام کرنے والے لوگوں کے رشتہ داروں کو پاکستانی کرنسی میں دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو اس روپے کو اپنی فوری ضروریات کو پورا کرنے یا اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے خرچ کر دیتے ہیں لیکن بچت نہیں کرتے یا کر سکتے۔ یہ روپیہ بازار میں آ تو جاتا ہے لیکن اسی تناسب سے ملک میں پیداوار نہیں بڑھتی۔ لہٰذا سرمایہ داری نظام کے طلب اور قیمت والے قانون کی وجہ سے جوں ہی مانگ بڑھتی ہے اور اشیاء کی فراہمی نہیں بڑھتی تو قیمتیں اس تناسب سے بڑھ جاتی ہیں۔ مانا کہ اس رقم کا کچھ حصہ درآمد شدہ مال پر بھی خرچ ہوتا ہے۔ لیکن دولت کو کھپانے کی خاطر درآمدات کو بڑھانا اور زرمبادلہ کو پھونک دینا پیداواری عمل سے گریز کرنے کے برابر ہے اور اقتصادی اور مالی پالیسیوں کے دیوالیہ پن کی علامت ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تیل برآمد کرنے والے مسلم ممالک کے ساتھ پاکستان کے اقتصادی تعلقات فقط ان ملکوں کو مال اور ہنر مند کرنے پر ہی مشتمل نہیں ہیں۔ ان ملکوں کی طرف سے پاکستان میں براہ راست اور قرضوں کی شکل میں سرمایہ بھی لگایا جارہا ہے۔ جس سے ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس سرمایہ کاری کی نوعیت کیا ہے، یہ کس سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ کے اندر ہورہی ہے اور ان سے کن نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مسلم ممالک کی طرف سے پاکستان میں کی جانے والی سرمایہ کاری پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سرمایہ اکثر ان منصوبوں میں لگایا جارہا ہے جن سے خود ان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں: یعنی سیمنٹ اور غذائی اشیاء۔ سعودی عربیہ کے پانچ منصوبوں میں سے دو سیمنٹ فیکٹریاں کی توسیع پر مشتمل ہے۔ ابوظہبی کے تین منصوبوں میں سے ایک کیمیائی کھاد کی فیکٹری اور ایک سبزیاں اگانے اور مویشی پالنے کا منصوبہ ہے۔ ایران کے منصوبوں میں دو سیمنٹ فیکٹریاں ،ایک کیمیائی کھاد کی فیکٹری، ایک زرعی صنعتی کامپلیکس (میانوالی) اور چار آبپاشی اور زراعت کی اسکیمیں ہیں (۱۹۷)۔ ان تمام منصوبوں کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ سیمنٹ اور غذائی اشیاء کی پیداوار بڑھانے سے ہے جو ان ملکوں کی بہت بڑی ضرورت ہیں اور جواب بھی ان ملکوں کو جانے والی پاکستانی برآمدات کے کثیر حصہ کی تشکیل کرتی ہیں۔ ایران اور پاکستان کے مشترکہ وزارتی کمیشن کے اعلامیہ میں واضح طور پر درج ہے کہ ایران کو اختیار ہے کہ وہ مشترکہ سرمائے سے لگائی ہوئی سیمنٹ اور کپڑے کی ملوں اور میانوالی مویشی منصوبے کی پیداوار کا اس تناسب سے حصہ لے لے جس تناسب سے اس نے سرمایہ لگایا ہے۔ مزید یہ کہ ان پر کوئی برآمدی ڈیوٹی نہیں لگائی جائے گی (۱۹۸)۔

مسلم ممالک، خاص طور پر لیبیا کی طرف سے پاکستان کو بعض قرضے ایسے بھی ملے ہیں جو کسی مخصوص منصوبے کے لیے نہیں ہیں۔ لیکن ان کے طریقہ استعمال کا انحصار قرضہ دینے والے ممالک کی نیت پر نہیں ہے بلکہ پاکستان کی معیشت کے کردار پر ہے۔ جب تک یہ معیشت جدید سامراجی غلبے سے آزاد نہیں ہوتی اس وقت تک تمام اقتصادی سرگرمیاں مفلوج سرمایہ داری کے دائرے کے اندر ہی ہوتی رہیں گی۔ چاہے ان سرگرمیوں کے لیے رقم کہیں سے بھی حاصل ہو۔

مسلم ممالک کے ساتھ بڑھتے ہوئے اقتصادی تعلقات کی وجہ سے پاکستان کی اپنی سرمایہ

کاری کی اور دیگر غیر ملکی سرمایہ کاری کی فوقیات کافی حد تک اثر انداز ہوئی ہیں۔ اس کی ایک مثال امریکہ اور پاکستان کا وہ مشترکہ منصوبہ ہے جس کے تحت گوشت پیک کرنے کا کارخانہ لگایا جا رہا ہے (۱۹۹)۔ ظاہر ہے کہ یہ کارخانہ گوشت برآمد کرنے کی غرض سے لگایا جا رہا ہے اور نہ کہ مقامی ضرورت کے لیے، اگر وسیع پیمانے پر اس قسم کے کارخانے لگ گئے تو اس کا اثر پاکستان کے عوام کی صحت پر بہت برا ہوگا۔ گوشت کی قیمت پہلے سے بہت زیادہ ہے اور بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، مگر جب یہ کارخانے قائم ہو جائیں گے تو ان کا اثر مچھلی بندر سے بھی برا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو گوشت، مچھلی اور جھینگے کے مقابلے میں بہت زیادہ مقبول غذا ہے اور دوسرے مچھلی کی طرح گوشت کا مٹنے کا موسم نہیں ہوتا کہ کارخانوں کو مال سپلائی کرنے کے بعد بھی یہ مقامی منڈی میں مناسب مقدار میں فراہم ہو جائے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جب کوئی گائے یا بکری کٹتی ہو تو اس کے تمام حصے بازار میں دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن گوشت کے کارخانے لگ جانے کے بعد قصائیوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اچھا گوشت فیکٹریوں کو سپلائی کریں اور مقامی منڈی میں ہڈیاں، چھچھڑے اور دوسرے رد کیے ہوئے حصے فروخت کریں۔

خلیج کی دولت کے چکر میں پاکستان کی اقتصادی فوقیات جس طرح سے متاثر ہوئی ہیں اس کا عکس ہمیں تعمیراتی سرگرمیوں میں ملتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں نہ فقط پانچ اور چار ستاروں والے کئی عالیشان ہوٹل تعمیر ہو رہے ہیں، بلکہ کراچی میں کلفٹن کے ساحل پر ایک جوئے کا کسینو بھی تیار ہو رہا ہے۔ کراچی کو مشرق وسطیٰ کا اکاپولکو یا عیاشی کا اڈہ بنانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ اخباروں میں اشتہارات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب شہزادوں اور دیگر غیر ملکی امراء کے لیے محل اور عالیشان کوٹھیاں تعمیر کرنے پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ پاکستان کی مجموعی قومی 'پیداوار' میں پہلے ہی اس قسم کی فضول 'خدمات' کا حصہ نصف کے برابر تھا۔ اب اس کا تناسب اور بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بات پیداوار کے بجائے طفیلیہ پن کے رجحان کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہے۔ اس رجحان میں طفیلیہ پن کے علاوہ عصمت فروشی کا عنصر بھی شامل ہے۔ کویت کے ایک اخبار نے لکھا تھا کہ خلیج کے ممالک میں پاکستان سے دس ہزار طوائفیں برآمد کی گئی تھیں اور ان کے زرمبادلہ کو ارسال کرنے کے لیے یونائیٹڈ بینک نے خصوصی انتظامات کیے تھے (۲۰۰)۔

خلیج کے ممالک میں سنہری موقع دیکھ کر اور پاکستان میں غیر یقینی حالات سے پریشان ہو کر پاکستان کے کئی سرمایہ داروں نے اپنا سرمایہ پاکستان سے کھینچ کر خلیج میں لگایا ہے۔ اس طرح سے ان ملکوں کے ساتھ خیر سگالی پاکستان سے سرمایہ کے فرار میں معاون بن گئی ہے۔

پاکستان اور خلیج کے ممالک کے درمیان بڑھتے ہوئے اقتصادی تعلقات کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کا آزاد ہونا اور پیداواری قوتوں کا آگے بڑھنا تو درکنار، الٹا پاکستان بیرونی قرضوں، محتاجی اور پسماندگی کے دلدل میں اور بھی دھنستا جا رہا ہے۔ اور اس کی معیشت دن بدن طفیلیہ کردار ادا کرتی جا رہی ہے۔ بظاہر سامراجی ملکوں کی بجائے تیسری دنیا کے دیگر ملکوں کے ساتھ تجارت اور اقتصادی تعاون بڑھانا ایک اچھی بات ہے۔ لیکن اس کا مطلب لازمی طور پر سامراج کے پنجے سے آزادی حاصل کرنا اور اپنی معیشت کو ترقی دینا نہیں ہوتا۔ اہم بات یہ ہے کہ اقتصادی تعاون کرنے والے ملکوں کی حیثیت کیا ہے۔ اگر دونوں سامراجی ملکوں کے دست نگر ہیں اور دونوں سامراج کی عالمی اور علاقائی حکمت عملی کے پابند ہیں، تو یہ دو آزاد مملکتوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ سامراج کے حاشیہ برداروں کی طرح آپس میں لین دین کر رہے ہیں۔

تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہونے کی وجہ سے شرائطِ تجارت تو یقینی طور پر تیل برآمد کرنے والے ممالک کے حق میں ہو گئی ہیں لیکن اس سے ان کی معاشی و سیاسی آزادی عمل میں نہیں آئی۔ الٹا ان کے غیر مقبول حکمران اپنے تحفظ کے لیے سامراجی طاقتوں کے ساتھ اور بھی گہرے طریقے سے منسلک ہو گئے۔ البتہ ان کے ہاتھوں میں غیر معمولی دولت کے ارتکاز کی وجہ سے ان کے اور علاقے کے غریب ملکوں کے درمیان اقتصادی و سیاسی تعلقات نے نئی صورت اختیار کر لی، محتاجی ایک نئی شکل میں ابھری اور علاقے میں ایک نیا تضاد پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ تضاد بنیادی طور پر علاقے کے غریب اور امیر ملکوں کے درمیان نہیں بلکہ عالمی سامراج کے عام تضاد کا ایک حصہ ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے جنوبی اور جنوب مغربی ایشیا پر سامراجی غلبے کے ماضی اور حال پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ماضی میں نوآبادیاتی سامراجیت نے ہمارے علاقے کو یکساں طور پر متاثر نہیں کیا۔ سامراجی طاقتوں، خاص طور پر انگلستان نے علاقے کے مختلف ملکوں پر ان کے قدرتی وسائل

اور فوجی اہمیت کے لحاظ سے مختلف رول عائد کیا، ان کی پیداواری قوتوں کو آگے بڑھنے نہیں دیا اور ان کے درمیان آزادانہ تعلقات کو فروغ نہیں پانے دیا۔ ان کے درمیان جو بھی تعلقات پیدا ہوئے یا ان ملکوں کے اندر جو بھی معاشی و سماجی ترقی ہوئی وہ سامراجی مفادات کے تابع تھی۔ لہٰذا رسمی آزادی مل جانے کے بعد یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ ایک طرف ہندوستان اور پاکستان جیسے کثیر آبادی والے ملک تھے جن میں نہ فقط وسیع پیمانے پر زرعی پیداوار کرنے کی صلاحیت تھی بلکہ جن میں گماشتہ سرمایہ دار طبقہ اور بڑی تعداد میں تکنیکی ماہرین اور ہنرمند مزدور بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے برعکس خلیج کے اکثر علاقوں میں دقیانوسی سماجی رشتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، ان میں زرعی پیداوار کی صلاحیت نہیں تھی اور وہاں تعلیم کے فقدان کی وجہ سے سماج میں وہ عنصر پیدا نہیں ہوا تھا جو جدید اقتصادی ترقی کے ڈھانچے کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ جب تک ان ملکوں میں وسیع پیمانے پر تیل نہیں نکلا تھا یا تیل کی قیمتوں میں شدید اضافہ نہیں ہوا تھا اس وقت تک علاقہ کے باہمی تعلقات میں کوئی اہم تبدیلی نہیں آئی۔ لیکن جب عالمی سامراج کے تضاد کے گہرے ہو جانے کی وجہ سے تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو اپنی دولت کا اچھا خاصہ حصہ ہاتھ آ گیا تو ان میں یہ خواہش اور صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بڑھائیں، بھاری مقدار میں غذائی اشیاء درآمد کریں، جدید آسائشوں کے ساتھ لیس ہونے کی خاطر اپنے ملکوں کو 'جدید' بنائیں اور ان سرگرمیوں کے لیے مختلف ملکوں سے ہنرمند اور تکنیکی مہارت درآمد کریں۔ بھاری مشینری، جنگی سامان، جدید اشیائے صرف اور اعلیٰ سطح کی فنی مہارت تو مغرب کے سامراجی ملکوں سے منگوائی جا سکتے تھے، لیکن غذائی اشیاء، درمیانی سطح کی مہارت و ہنرمند اور مزدور سستے داموں میں پاکستان جیسے ملکوں سے دستیاب ہو سکتے تھے۔ گو پاکستان کو خود اپنی ترقی کے لیے ان ہنرمندوں کی ضرورت ہے اور وہ غذائی اشیاء میں خود کفیل نہیں ہے، لیکن سامراجی تسلط کے تحت اس کو جو طبقاتی ساخت ورثہ میں ملی اور 'ترقی' کی، جس نہج پر وہ گامزن ہے اس میں آسان اور تیز طریقے سے دولت کمانے کو دوسری باتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لہٰذا پاکستان کی طرف سے اپنی معاشی ترقی کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے اندھا دھند مشرق وسطیٰ میں دولت سمیٹنے کی تگ و دو میں لگ جانا، اس کی معیشت کے محتاج اور مفلوک کردار کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ پاکستان میں لگاتار سامراجی تسلط کی وجہ سے اس کی

پیداواری قوتیں آزاد نہیں ہو سکی ہیں اور وہ اپنی آزاد معیشت قائم نہیں کر سکا ہے۔ اگر اس دائرے میں رہتے ہوئے وہ دوسرے ایسے ملکوں کے ساتھ اقتصادی تعلقات بڑھاتا ہے جن کی معیشت خود عالمی سامراجی معیشت کا اٹوٹ حصہ ہے تو پھر تجارت کا رخ اور سرمایہ کاری اور قرضوں کا ذریعہ سامراجی ملکوں سے پھر کر تیسری دنیا کے ایسے ملکوں کی طرف ہو جانے سے پاکستان کی معیشت کے بنیادی کردار میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کی شروعات میں بتایا ہے، ہماری موجودہ غربت اور پسماندگی کوئی فطری بات نہیں ہے، اور نہ ہی یہ سماجی ارتقا کی کوئی لازمی منزل ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ سامراجی تسلط ہے، جس کی بدولت ہماری معیشت کی ساخت اس طرح سے توڑ مروڑ دی گئی ہے کہ ہمارا ملک عالگیری سامراجی معیشت کا ایک پسماندہ، مفلوج اور محتاج حصہ بن جائے۔ یاد رہے کہ یہ عمل کسی سازش کے تحت نہیں بلکہ سرمایہ داری کی منطق کے لازمی نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔ جدید سامراجی تسلط اور استحصال کی نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ ظلم و لوٹ کھسوٹ کے عمل میں سامراجیوں اور مقامی استحصالی طبقوں کے مفادات اس قدر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ محکوم ملک کی پسماندگی خود مقامی حکمران طبقے کے مفاد میں ہو جاتی ہے۔ سامراجیوں کے ساتھ اس کے تضادات سطحی اور خسیس باتوں تک محدود ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اقتصادی ترقی میں اپنے 'جائز' حصے کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے وقتی طور پر سانس لینے دیا جائے۔ درحقیقت سامراجیوں اور ان کے دست نگر مقامی حکمرانوں کے درمیان اتحاد بھی ہے اور تضاد بھی۔ اب تک سامراجیوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ تضادات کو سامراجی دائرے کے اندر حل کیا جائے اور اتحاد کو مستحکم کیا جائے۔ لیکن آج کل سامراج کے اندرونی تضادات اس قدر گہرے ہو چکے ہیں اور دنیا کی طاقت کے توازن میں اس قدر تبدیلی آ چکی ہے کہ خود سامراجیوں اور ان کے حاشیہ برداروں کے مابین تعلقات میں ترمیم ناگزیر ہو گئی ہے۔ اگر سامراجی خوش اسلوبی کے ساتھ اس تضاد کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کا نتیجہ سامراجیوں اور ان کے مقامی گماشتوں دونوں کے لیے سنگین نکلے گا۔ گماشتے یہ بات اچھی طرح سے سمجھتے ہیں لہذا وہ اپنے بلند بانگ نعروں کے باوجود اس کوشش میں ہیں کہ بین الاقوامی تجارت کی شرائط شرافت سے تھوڑا سا ان کے حق میں کر دی جائیں تاکہ بڑے تصادم سے بچا جا سکے۔ ممکن ہے کہ سامراج

کو مجبور ہو کر یہ شرط ماننی پڑ جائے۔ لیکن ایسا کرنے سے بنیادی تضاد حل نہیں ہوگا اور پسماندہ ملک ترقی یافتہ نہیں ہو جائیں گے کیونکہ آج کے دور میں اقتصادی ترقی کا مطلب ہے ایسا معاشی عمل جس سے کسی ملک کی پیداواری قوتیں آزاد ہوں، خود انحصاری پیدا ہو اور سماجی تفریق ختم ہو۔ ایسی ترقی یقیناً مقامی لٹیروں کے حق میں نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی ایسی ترقی کا بیڑا نہیں اٹھا سکتے۔ وہ سامراج سے اس حد تک کبھی ٹکر نہیں لے سکتے۔ وہ اپنا سر بچانے کی خاطر سامراج کے ساتھ مفاہمت کی کوشش کرتے رہیں گے اور ملک کو پسماندگی کی دلدل میں دھکیلتے رہیں گے۔ اس لیے آج کے دور میں 'قومی' سرمایہ دار طبقے کی قیادت میں سامراج دشمن بورژوا جمہوری انقلابات یا 'آزاد قومی جمہوریت' کی بات کرنا سراسر خود فریبی، مکاری اور عوام دشمنی ہے۔ سامراج کا بنیادی تضاد تیسری دنیا کے محکوم عوام کے ساتھ ہے اور فقط عوام ہی حقیقی سامراج دشمن جدوجہد چلا سکتے ہیں۔ ملک کی معیشت کو آزاد کروا سکتے ہیں اور اقتصادی ترقی لا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے انہیں غیروں کی بالادستی، اقتصادی پسماندگی اور سماجی ناانصافی و ظلم کو بیک وقت فروغ دینے والے سماجی ڈھانچے کو مکمل طور پر بدلنا ہوگا۔

اصطلاحیں

عطیہ:

(Grant): عام معنوں میں عطیہ وہ رقم یا شے ہے جو کسی دوسرے کو بلا معاوضہ دے دی جائے۔ بیرونی 'امدادی' پروگراموں کے تحت سامراجی ملک کچھ چیزیں اور رقمیں اپنے بالاتر مفاد کی خاطر پسماندہ ملکوں کو یونہی دے دیتے ہیں لیکن کل 'امدادی' رقم میں ان کا تناسب بہت کم ہوتا ہے۔ بعض اوقات جس رقم کو عطیہ کے طور پر دکھایا جاتا ہے وہ درحقیقت قرضہ ہی ہوتا ہے جسے سود کے ساتھ لوٹانا ہوتا ہے۔

قرضہ:

(Loan): 'امداد' کے تحت دی جانے والی بیشتر رقم قرضے کی شکل میں ہوتی ہے جس کے لیے ادائیگی کی مدت، سود کی شرح اور دیگر شرائط پہلے سے مقرر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز نقد خریدی جاتی ہے پھر بھی اس کو قرض کے تحت دکھایا جاتا ہے

منصوبہ جاتی امداد:

(Project assistance): وہ غیر ملکی قرض جو ملک کے اندر کسی مخصوص اقتصادی منصوبے کے لیے دیا گیا ہو اور جو کسی دوسرے کام کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا ہو۔ سامراجی ملک اکثر کسی بھی منصوبے کے لیے مکمل رقم فراہم نہیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے پسندیدہ منصوبے میں روپیہ میں چار آنے چھ آنے ڈال کر "امداد حاصل کنندہ ملک کو مجبور کرتے ہیں کہ باقی رقم وہ خود فراہم کرے۔

تکنیکی امداد:

(Technical Assistance): یہ ''امدادی'' رقم کا وہ حصہ ہے جو غیر ملکی مشیروں کی تنخواہوں، فیس اور اخراجات پر خرچ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے تحت غیر ملکی امداد کے ذریعے فنی تعلیم کے ادارے بھی کھولے گئے ہیں۔

مشروط ادھار:

(Tied credit): وہ ''رقم'' جو ایک ملک کسی دوسرے ملک کو اس شرط پر بطور ادھار دے کہ وہ رقم کو دینے والے ملک کا مال خریدنے پر خرچ کرے گا، چاہے اسے وہی چیز کسی اور ملک سے سستے داموں کیوں نہ مل رہی ہو۔ درحقیقت یہ رقم ادھار لینے والے کو دی نہیں جاتی بلکہ اس کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ اسے وہ مال دیا جاتا ہے جو اس نے ادھار لیا ہے۔ مقررہ مدت کے اندر ادھار لینے والے کو اس مال کی قیمت اور سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر منصوبہ جاتی امدادی پروگراموں میں مشروط ادھار شامل ہوتا ہے۔ کسی منصوبے کے لیے قرض اس شرط کے ساتھ دیا جاتا ہے کہ اس منصوبے میں استعمال ہونے والی درآمدی اشیاء قرض دینے والے ملک سے خریدی جائیں۔

سپلائرز کریڈٹ:

(Supplier's Credit): مشروط ادھار کی ایک قسم جس کے تحت امریکہ اپنا مال بیچنے کی خاطر دوسرے ملکوں کو ادھار دیتا ہے۔ یہ ادھار منصوبوں کی بجائے عام تجارت میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

عوامی قانون نمبر 480:

(PL-480): یہ وہ قانون ہے جس کے تحت امریکی گندم پاکستان اور دوسرے ملکوں کو دی جاتی ہے۔ اس قانون کے دوسرے حصے یا ٹائیٹل کے تحت فاضل زرعی اشیاء دوسرے ملکوں کو بطور

عطیہ دی جاسکتی ہے۔ لیکن اس ٹائٹل کا اطلاق بہت کم ہوا ہے۔ اصل چیز ٹائیٹل نمبر ایک ہے جس کے تحت غریب ملکوں کو ان کی اپنی کرنسی میں امریکی گندم فروخت کی گئی اور جس کی وجہ سے امریکہ نے ان ملکوں میں اربوں روپے جمع کر لیے ہیں۔ اب امریکی کی فاضل اشیاء کے لیے ڈالر میں ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔ اور اس اسکیم کے حیثیت ایک عام مشروط ادھار کی سی ہوگئی ہے۔ اس 'امدادی' پروگرام کا مقصد ہے امریکہ کی فاضل زرعی پیداوار کو بطور ہتھیار بنا کر امریکہ کی زرعی اشیاء کے لیے منڈی وسیع کرنا اور امریکہ کے بیرونی مفادات کو تقویت پہنچانا۔

کولی قرضے:

(Cooley Loans): عوامی قانون نمبر 480 کے تحت امریکہ نے پاکستان میں جو روپیہ جمع کر لیا ہے اسے وہ مختلف طریقوں سے استعمال کرتا ہے۔ ان میں سے اکثر کا مقصد روپیوں کو دوبارہ ڈالر میں منتقل کرنا ہے۔ ان روپیوں سے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے جس میں سے پاکستان میں امریکی سرمایہ داروں کو مقامی اخراجات کے لیے روپیوں میں قرضے دیے جاتے ہیں۔ ان قرضوں کو کولی قرضے کہا جاتا ہے۔

ہنگامی قرضے:

(Stand-by Loans): جب ایک مقروض ملک اپنے قرض کی ادائیگی کرنے کے لائق نہیں رہتا تو وہ قرض خواہوں کے بالائی ادارے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے رجوع کرتا ہے۔ یہ ادارہ اپنے اعلیٰ افسران کو مصیبت زدہ ملک بھیجتا ہے جہاں وہ اس ملک کے اعلیٰ حکام سے مذاکرات کرتے ہیں اور ان سے وعدہ لیتے ہیں کہ وہ ادارے کے تجویز کردہ اقدامات پر عمل کریں گے۔ اس کے بعد اسے ہنگامی قرضہ دیا جاتا ہے۔ اس کے فوراً بعد قرضدار ملک اپنی اندرونی معاشی پالیسیوں میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی تجویزوں کے مطابق تبدیلیاں کرتا ہے۔ ان تبدیلیوں میں عام طور پر یہ باتیں شامل ہیں: اپنے روپے کا نرخ کم کرنا، درآمدات پر سے پابندیاں دور کرنا، مزدوروں کی تنخواہوں کو بڑھنے سے روکنا، قیمتوں پر سے کنٹرول ہٹانا، سماجی بھلائی کے کاموں کے لیے رقم گھٹانا اور زرمبادلہ کی فراہمی پر سے پابندیاں ہٹانا۔

بیرونی امداد:

(Foreign aid): مندرجہ بالا تمام لین دین کو بیرونی امداد کہا جاتا ہے۔

وعدہ:

(Pledge): قرضہ یا امداد لینے والا ملک جب اقتصادی منصوبے کا اعلان کرتا ہے تو اس کے ساتھ بیرونی وسیلوں کی ضرورت کا تخمینہ بھی پیش کرتا ہے اور مختلف قرضہ دینے والے ملکوں سے امداد مانگتا ہے۔ یہ ملک سب سے پہلے ایک رقم دینے کے لیے اصولی طور پر وعدہ کرتے ہیں۔

منظوری:

(Committment): اصولی طور پر رضامند ہو جانے کے بعد امداد دینے والے ملک آپس میں مذاکرات کر کے قرضہ جاتی رقم منظور کرتے ہیں۔ یہ رقم عام طور پر وعدہ کی ہوئی رقم سے کم ہوتی ہے۔

وصولی:

(Disbursement): امداد حاصل کنندہ کو عام طور پر منظور کی ہوئی مکمل رقم حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا کسی ملک کو کتنا قرضہ ملا اس کا اندازہ منظور شدہ رقم سے نہیں بلکہ وصول کردہ رقم سے ہی ہو سکتا ہے۔ سرکاری مطبوعات میں اکثر فقط منظور شدہ رقم کے اعداد و شمار شامل ہوتے ہیں۔

قرض کی ادائیگی:

(Debt servicing): مقررہ ٹائم ٹیبل کے مطابق قرضہ لینے والے ملک کو قرضے اور سود کی رقم قرض خواہ ملک کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ پاکستان سمیت بہت سے ملک اس قدر مقروض ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک قرضہ ادا کرنے کے لیے دوسرا قرضہ لینا پڑتا ہے۔

اے آئے ڈی:

(A.I.D): امریکہ کا امدادی ادارہ جس کے ذریعہ دوسرے ملکوں میں مختلف امدادی پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ اس ادارے کے دونمایاں پروگرام ہیں فاضل گندم کی نکاسی اور پسماندہ ملکوں کی پولیس کو فسادات روکنے کے جدید طریقوں میں تربیت دینا۔

بین الاقوامی مالیاتی فنڈ:

(I.M.F): امریکہ کی بالادستی کے تحت یہ ادارہ 1944ء میں قائم کیا گیا۔ اوائل میں اس کا مقصد سرمایہ دار ملکوں کے درمیان توازن ادائیگی اور زرمبادلہ کی شرح کے مسائل سے نبٹنا تھا۔ اب یہ ادارہ ان باتوں کے علاوہ پسماندہ ملکوں کی مالی پالیسیوں کو سامراجی مفادات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہنگامی قرضے اور 'استحکامی' پروگرام اس کے اہم ہتھیار ہیں۔ یہ ادارہ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں واقع ہے۔

عالمی بینک:

(World Bank): دوسری جنگ عظیم کے بعد سرمایہ دار دنیا میں ترقیاتی منصوبوں کی مالی امداد کرنے کی غرض سے یہ بینک قائم کیا گیا۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی طرح عالمی بینک پر بھی امریکہ کا غلبہ ہے۔ اس کا دفتر اسی بلڈنگ میں ہے جس میں بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کا دفتر ہے۔ عالمی بینک اور اس کے دو متعلقہ ادارے بین الاقوامی ترقیاتی انجمن (IDA) اور بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن (IFC) سامراجی ملکوں کی طرف سے تیسری دنیا کے غرب ملکوں کو قرضے فراہم کرتے ہیں اور ان کی اقتصادی ترقی کے کردار کو متاثر کرتے ہیں۔ عالمی بینک کے موجودہ صدر بدنام زمانہ سابق امریکی وزیر دفاع رابرٹ میکنامارا ہیں۔

کنسورشیم:

(Consortium): پاکستان کو اقتصادی امداد فراہم کرنے کے لیے قرضہ دینے والے

سامراجی ملکوں نے اپنا یہ کلب قائم کیا ہے جس میں امریکہ کے علاوہ انگلستان، مغربی جرمنی، فرانس، جاپان، کینیڈا، اٹلی، بیلجیم، ہالینڈ، عالمی بینک اور اسکا متعلقہ ادارہ بین الاقوامی ترقیاتی انجمن شامل ہیں۔

مجموعی قومی پیداوار:

(Gross National Product): ملک کی کل سالانہ دولت جس میں تمام پیداوار (مثلاً گندم، کپڑا، ریڈیو، جوتے) اور تمام خدمات (مثلاً بال کٹوانے کا خرچ، بس کا کرایہ، بیوپاری کا نفع، کمیشن، مکان بنوانے کے اخراجات وغیرہ) شامل کیے جاتے ہیں۔ بیرون ملک لگے ہوئے سرمایہ سے آمدنی اور بیرون ملک کام کرنے والوں کا بھیجا ہوا روپیہ بھی اس میں شامل کیا جاتا ہے۔

مجموعی داخلی پیداوار:

(Gross Domestic Product): اس پیمانے میں ملک کے اندر ہونے والی کل پیداوار اور خدمات کو شامل کیا جاتا ہے۔ باہر سے ارسال ہونے والی دولت کو حساب میں نہیں شامل کیا جاتا۔

فی کس آمدنی:

(per Capita Income): سال بھر کی مجموعی پیداوار خدمات کو اگر اس سال کی کل آبادی سے تقسیم کر دیا جائے تو اوسط فی کس آمدنی مل جائے گی۔ یہ پیمانہ لوگوں کو حاصل ہونے والی حقیقی آمدنی کی عکاسی نہیں کرتا۔ اس لیے اسے فی کس قومی یا داخلی پیداوار کہنا بہتر ہوگا۔

اشیائے صرف:

(Consumption Goods): وہ اشیاء یا مصنوعات جو کہ فقط صرف کی جاسکتی ہیں لیکن ان کے استعمال سے کوئی دوسری چیز پیدا نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر کھانے پینے کی اشیاء، جوتے، کپڑے وغیرہ۔ بعض مصنوعات صرف پائیدار (Consumer durables) ہوتی ہیں، جیسے کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر وغیرہ۔

اشیائے پیداوار یا اشیائے سرمایہ کاری:

(Investment Goods or Capita goods): وہ اشیاء جن کو بطور سرمایہ استعمال کیا جاسکتا ہے اور جن کے استعمال سے مزید پیداوار کی جاسکتی ہے یا کوئی خدمات انجام دی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر مختلف قسم کی مشینیں اور آلات۔

ذرائع پیداوار:

(Means of Production): تمام چیزیں جن پر پیداوار کرنے کی غرض سے انسانی محنت لگ سکتی ہے اور وہ تمام آلات، جن کے ذریعے انسان کی محنت پیداور کے لیے بروئے کار لائی جاسکتی ہے، مل کر ذرائع پیداوار کہلاتے ہیں۔ سب سے عام پیداوار کا ذریعہ زمین ہے۔ اس کے علاوہ خام مال، ادھورا تیار مال، مشینیں اور آلات ذرائع پیداوار میں شامل ہوتے ہیں۔

پیداواری قوتیں:

(Productive Forces): انسان کی محنت کے بغیر ذرائع پیداوار بے کار ہیں۔ لیکن دونوں کے ملنے سے پیداواری قوت بن جاتی ہے۔ جب تک سماج کی پیداواری قوتیں دبی ہوئی ہیں، اس وقت تک وہ ترقی نہیں کرسکتا۔

مالکی یا حصصی سرمایہ:

(Equity Capital): جب ایک سرمایہ دار یا کئی سرمایہ دار مل کر ایک کارخانہ لگاتے ہیں یا کوئی کمپنی کھولتے ہیں تو اس کو چلانے کے لیے تمام تر سرمایہ وہ اپنی پونجی میں سے نہیں لگاتے۔ وہ ایک حصہ حکومت، بینکس یا دوسرے اداروں سے بطور ادھار لیتے ہیں۔ لگے ہوئے سرمایہ کا وہ حصہ جو ان کی اپنی پونجی ہے اس کو حصصی سرمایہ کہتے ہیں۔

زیر استعمال سرمایہ:

(Employed Capital): حصصی سرمایہ اور ادھار لیا ہوا سرمایہ جو کسی کاروبار میں لگا ہوا

ہے ان کو ملا کر زیر استعمال سرمایہ کہتے ہیں۔

مستقل سرمایہ یا مستقل اثاثے:

(Fixed capital or assets): وہ سرمایہ جو جلدی استعمال نہیں ہو جاتا اور کافی عرصے تک اپنی ہیئت برقرار رکھتا ہے۔ مثلاً فیکٹری کی بلڈنگ، مشینیں، بھٹیاں وغیرہ۔

قدر میں اضافہ:

(Value Added): سرمایہ دارانہ علم معاشیات میں یہ لفظ دو اہم معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (۱) صنعتی عمل کے ضمن میں، یہاں قدر میں اضافے کا مطلب ہوتا ہے تیار مال کی قیمت اور خام مال کی قیمت میں فرق۔ اس میں مزدوروں کی اُجرت، صنعتی عمل کے اخراجات اور منافع وغیرہ شامل کیے جاتے ہیں۔ (۲) اکاؤنٹ رکھنے کے ضمن میں یہاں تیار مال کی قیمت میں سے خام مال کی قیمت کے علاوہ مزدوروں کی اجرت، فیکٹری کے اخراجات وغیرہ بھی نکالے جاتے ہیں۔ یعنی اجرت محض خام مال کو مصنوعات کا نام دینے کے سلسلے میں جو نفع کمایا جاتا ہے اس کو قدر میں اضافہ کہا جاتا ہے۔

افراطِ زر یا مہنگائی:

(Inflation): لفظی معنوں میں اس کا مطلب ہوا، پیداوار کے مقابلے میں کاغذی زر کی افراط لیکن اس کا اصل مطلب ہے مہنگائی۔ جب کسی ملک کی پیداوار میں اضافہ نہیں ہو رہا ہو مگر بہت سے نوٹ چھاپ دیے جائیں یا پھر باہر سے روپیہ بھجوا دیا جائے تو اس سے بازار میں چیزوں پر دباؤ پڑے گا اور مہنگائی بڑھ جائے گی۔

قوت خرید:

(Purchasing Power): مہنگائی بڑھنے کے ساتھ اگر کسی شخص تنخواہ نہیں بڑھی تو وہ اسی تنخواہ سے اب کم چیزیں خرید سکتا ہے۔ یعنی اس کی قوت خرید کم ہو گئی۔

حقیقی اُجرت:

(Real Wage): اگر مزدوروں کی اجرتوں میں پانچ سال میں 25 یا 50 فیصد اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ضروری چیزوں کی قیمتیں دوگنی یا تین گنی ہو جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ درحقیقت مزدور کی اجرت بڑھی نہیں بلکہ گھٹی ہے۔ اس لیے اجرتوں کے بڑھنے یا گھٹنے کا حساب لگانے کے لیے ظاہری اجرتوں کو دیکھنا کافی نہیں ہوتا۔ ظاہری اجرت کے ساتھ جب مہنگائی کا بھی حساب لگایا جاتا ہے تب اجرتوں کا حقیقی حساب ملتا ہے۔

ٹیکس تعطیل یا ٹیکس کی چھوٹ:

(Tax Holiday): سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کرنے کے لیے حکومت بعض اوقات نئی صنعتوں کو ایک مدت تک ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیتی ہے۔ کچھ ملکوں میں یہ پالیسی غیر ترقی یافتہ علاقوں میں صنعت لگانے یا بنیادی صنعت قائم کرنے کے سلسلے میں بھی استعمال ہوئی ہے۔

ٹیکس میں کٹوتی:

(Rebate): مخصوص حالات میں سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کرنے کے لیے سرمایہ داروں کو 'نقصان' کا معاوضہ دینے کے لیے حکومت ادا شدہ ٹیکس کا ایک حصہ انہیں واپس کر دیتی ہے یا ادائیگی کے وقت رعایت کر دیتی ہے۔

گھسنے ٹوٹنے کا الاؤنس یا رعایت فرسودگی:

(Depreciation allowance): سرمایہ داروں کو حکومت کی طرف سے یہ رعایت بھی دی جاتی ہے کہ وہ اپنی مشینوں وغیرہ کی قدر میں گھسنے ٹوٹنے یا پرانے ہو جانے کی وجہ سے جو کمی واقع ہوتی ہے اسے اپنے ٹیکس میں سے کاٹ دیں۔

تحفظی ٹیکس:

(Tariff protection): ملک کے سرمایہ دار کو غیر ملکی مال کے مقابلے سے تحفظ دینے کے

لیے حکومتیں درآمدی مال پر بھاری ڈیوٹیاں عائد کر دیتی ہیں۔ ایسے تحفظ سے ملک کی صنعت کو جائز حفاظت بھی مل سکتی ہے اور منافع خوری کے لیے ناجائز مواقع بھی۔

اعانت:

(Tarif protection): ملک کے سرمایہ دار کو غیر ملکی مال کے مقابلے سے تحفظ دینے کیلئے حکومتیں درآمدی مال پر بھاری ڈیوٹیاں عائد کر دیتی ہیں۔ ایسے تحفظ سے ملک کی صنعت کو جائز حفاظت بھی مل سکتی ہے اور منافع خوری کے لیے ناجائز مواقع بھی۔

اعانت:

(Subsidy): کسی بھی چیز کی قیمت فروخت گھٹانے کے لیے (مثلاً کیمیائی کھاد، گندم) یا ڈوبتے سرمایہ دار کو بچانے کے لیے حکومت کی طرف سے دی جانے والی امدادی رقم۔

حقیقی شرح تحفظ:

(Effective rate of protection): حکومتیں اپنے سرمایہ داروں کو بیرونی مال کے خلاف جو تحفظ دیتی ہیں اس کا اندازہ فقط درآمدی ڈیوٹیوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ مصنوعات کے تحفظ کی حقیقی شرح کا تخمینہ لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کی مقامی قیمتوں کا مقابلہ اُن قیمتوں سے کیا جائے جو ان کو عالمی منڈی میں مل سکتی ہیں۔ خام مال اور تیار مال کی قیمت فروخت کے درمیان فرق کو قدر میں اضافہ کہا جاتا ہے۔ اگر مقامی قیمتوں کے حساب سے قدر میں اضافے کے بیچ میں فرق کو مقامی قدر میں اضافے سے تقسیم کیا جائے تو ہمیں حقیقی شرح تحفظ مل جائے گی۔ اس جواب کو 100 کے ساتھ ضرب دینے سے ہمیں فیصد حقیقی شرح تحفظ مل جائے گی۔

سرمائے کا اندرونی بہاؤ:

(Capital inflows): سرمائے کا باہر سے ملک کے اندر آنا، خاص طور پر غیر ملکی سرمایہ کاری کی شکل میں۔

سرمائے کا بیرونی بہاؤ:

(Capital outflows): سرمائے کا ملک سے باہر جانا۔ یہ دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کرنے، قانونی اور غیر قانونی طور پر سرمایہ باہر لے جانے اور دوسری شکلوں میں ہو سکتا ہے۔

سرمائے کی واپسی:

(Repatriation of capital): سرمائے کے بیرونی بہاؤ کی ایک مخصوص شکل میں غیر ملکی سرمایہ دار اپنا سرمایہ واپس لے جاتا ہے۔

سرمائے کا فرار:

(Flight of capital): جب سرمایہ دار کسی ملک کے حالات اپنے لیے سازگار نہیں پاتے اور تیزی سے اپنا سرمایہ باہر نکالنے لگتے ہیں تو اس عمل کو سرمائے کا فرار ہونا کہتے ہیں۔

زرمبادلہ:

(Foreign exchange): عملی معنوں میں اس کا مطلب ہوتا ہے کسی ایسے دوسرے ملک کی کرنسی حاصل کرنا جس میں بین الاقوامی تجارت ہوتی ہو (مثلاً امریکی ڈالر) یا جو اتنی مضبوط ہو کہ تجارتی کرنسی میں آسانی سے تبدیل کی جا سکتی ہو (مثلاً سعودی ریال)۔ دوسرے ملکوں سے اپنی ضروریات کی چیزیں درآمد کرنے کے لیے پاکستان کو زرمبادلہ کی ضرورت ہے۔ یہ زرمبادلہ اپنی چیزیں برآمد کر کے اور دوسرے طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

برآمدی قیمت:

(F.O.B. Price): جب کوئی ملک کسی دوسرے ملک کو سامان برآمد کرتا ہے تو اس پر کوئی بھی مقامی ٹیکس عائد نہیں کرتا۔ برآمدی قیمت مقامی قیمت سے اکثر کم ہوتی ہے۔

درآمدی قیمت:

(C.I.F price): جب تک برآمد کیا ہوا مال اپنی منزل مقصود تک پہنچے اس وقت تک اس پر دو قسم کے مزید اخراجات ہو جاتے ہیں: ایک جہاز کا کرایہ اور دوسرا بیمے کا خرچ۔ لہٰذا درآمد کرنے والے ملک کے لیے جو قیمت بنتی ہے اس میں برآمدی قیمت، بار برادری اور بیمے کا خرچہ شامل ہوتے ہیں۔ اس قیمت کو درآمدی قیمت کہا جاتا ہے۔

توازن تجارت:

(Balance of trade): ہر ملک کو کوئی نہ کوئی چیز باہر سے درآمد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا اسے اپنی بھی کوئی چیز برآمد کرنی پڑتی ہے۔ درآمدات پر کیے جانے والے خرچ اور برآمدات سے کمائے ہوئے روپے کی تقابلی صورت کو توازن تجارت کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی ملک درآمدات پر کم روپیہ خرچ کرتا ہے اور برآمدات کے ذریعے زیادہ کماتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ توازن تجارت اس کے حق میں ہے۔ اگر معاملہ اس کے الٹ ہے تو کہا جاتا ہے کہ توازن تجارت اس کے خلاف ہے، جیسے کہ پاکستان کے ساتھ ہو رہا ہے۔

توازن ادائیگی:

(Balance of Payments): کوئی ملک فقط برآمدات کی وجہ سے زرمبادلہ نہیں کماتا اور نہ ہی وہ فقط درآمدات پر زرمبادلہ خرچ کرتا ہے۔ کمائی وہ دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کر کے یا اپنے ہنرمند بھیج کر یا ادھار یا بھیک مانگ کر بھی کر سکتا ہے۔ اس طرح خرچ وہ دوسرے ملکوں میں اپنی فوجوں پر یا بیرونی قرضے چکانے پر یا عطیہ دینے پر بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے کسی بھی ملک کے زرمبادلہ کی صورتحال معلوم کرنے کے لیے توازن تجارت پر نظر ڈالنا کافی نہیں ہے۔ اس توازن کے علاوہ دوسرے قسم کے بیرونی اخراجات اور کمائی کے توازن کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔ جب برآمدات سمیت کل زرمبادلہ کی کمائی اور درآمدات سمیت کل زرمبادلہ کے خرچ کے توازن کا حساب لگایا جاتا ہے تو ایسے توازن کو توازن ادائیگی کہا جاتا ہے۔ ویتنام کی جنگ کے دوران کئی

سالوں میں ایسا ہوا کہ امریکہ کا توازن تجارت تو اس کے حق میں تھا لیکن جنگی اخراجات کی وجہ سے مجموعی توازن ادائیگی اس کے خلاف تھا۔

شرائط تجارت:

(Terms of Trade): جس تناسب سے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے تیار مال کی قیمت بڑھتی ہے اسی تناسب سے تیسری دنیا کے خام مال کی قیمتیں نہیں بڑھتیں۔ کسی بھی ملک کے لیے درآمدات اور برآمدات کی اضافی قیمتوں کے پیمانے کو اس ملک کی شرائط تجارت کہا جاتا ہے۔

ظاہری قیمت:

(Nominal Value): بیرونی امداد کے پروگراموں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ منظور شدہ رقم امداد حاصل کنندہ کو نقد نہیں دی جاتی بلکہ اس رقم کے برابر مال دیا جاتا ہے۔ مال دیتے وقت اس کی وہ قیمت بتائی جاتی ہے جس قیمت پر وہ مال کھلے بازار میں بکتا ہے۔ ایسی قیمت کو ظاہری قیمت کہا جاتا ہے۔

طلب یا مانگ میں لچک:

(Demand elasticities): اگر امداد دینے والا ملک یہ کہے کہ جو مال اس نے امداد میں دیا ہے اس کو وہ اُس ظاہری قیمت پر فروخت کر سکتا ہے جس پر باقی مال کھلے بازار میں بک رہا ہے تو ایسا ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ سرمایہ دار منڈی میں ہر چیز کی مانگ میں لچک ہوتی ہے جو اس کی قیمت سے متعین ہوتی ہے۔ اگر قیمت زیادہ ہے تو مانگ کم ہوگی اور اگر قیمت کم ہے تو مانگ بڑھ جائے گی۔ منڈی میں مختلف خریداروں کے لیے اپنی اپنی ایک حد ہوتی ہے جس میں وہ کسی چیز کو خریدنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ قیمتوں کی نسبت سے مال کی مانگ میں پیدا شدہ لچک کو طلب یا مانگ یا لچک کہا جاتا ہے۔ ایک سیانا بیوپاری اپنے مال کی قیمت وہی مقرر کرے گا جس سے اسے مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔ ایسا کرنے کے لیے وہ کچھ عرصہ تک مال کی سپلائی تنگ بھی کر دیتا ہے۔ پاکستان میں سگریٹ کے کاروباری یہی چال کھیلتے ہیں۔ وہ کیپسٹن سگریٹ کی سپلائی

کم کر کے اس کی قیمت دو روپیے کے بجائے ڈھائی روپے کر دیتے ہیں اور پھر بھی کافی لوگ اسے خریدتے ہیں۔ لیکن خریداروں کی کمی کی وجہ سے تھوڑا سا اور مال بازار میں چھوڑ دیتے ہیں اور قیمت سوا دو روپے ہو جاتی ہے۔ اب خریدنے والوں کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بعد میں وہ دو روپے پر آ جاتے ہیں کیونکہ بہت دنوں تک مال کم کرنے سے مجموعی بکری پر برا اثر پڑتا ہے۔

قیمت متبادل استعمال:

(Opportunity cost): امدادی مال کی صحیح قیمت لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس مال کا متبادل استعمال کیا جائے تو اس کی کیا قیمت ملے گی اور منڈی میں فروخت ہونے والے باقی مال کی قیمت پر کیا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے مجموعی طور پر کوئی فائدہ نہ ہو (یعنی قیمت متبادل استعمال صفر ہو) یا الٹا نقصان ہو (یعنی قیمت متبادل استعمال منفی ہو)۔ متبادل طریقوں سے سرمایہ لگانے کے ذریعے ہونے والی متوقع آمدنی اور حقیقی آمدنی کے اس تقابلی پیمانے کو قیمت متبادل استعمال کہا جاتا ہے۔

زیر گردش زر:

(Currency in circulation): کسی بھی ملک کے مالی اثاثے بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: (۱) وہ رقم جو بینکوں اور دیگر مالی اداروں میں جمع کی ہوئی ہے (۲) وہ روپیہ جو نوٹوں اور سکوں کی شکل میں لین دین کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اس آخر الذکر روپے کو زیرِ گردش زر کہتے ہیں۔ اگر اس زر کی پشت پر پیداوار کی مناسب مقدار نہ ہو تو افراط زر یا مہنگائی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر امریکہ کے عوامی قانون نمبر 480 کے تحت جمع کی ہوئی مقامی کرنسی بینک سے طلب کر لی جائے یا بازار میں چھوڑ دی جائے تو اس ملک کا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

1. Hamza Alavi and Amir Khusro, "Pakistan: The Burden of U.S. Aid," in Imperialism and Underdevelopment : a reader, edited by Robert I. Rhodes, New York: Monthly Review Press 1970. (Originally published in Pakistan Today, new Series, No. 1, Autumn 1961).
2. Election Manifesto of Pakistan People's party, 1970. Lahore : Classic, p.7
3. R. Palme Dutt, India Today, Calcutta : Manisha, 1970.
4. Feroz Ahmed, "Partners in Underdevelopment: Pakistan and the U.S., "Merip Reports, No. 26 (March 1974), pp. 23-27.
5. Feroz Ahmed, "Le Pakistan malade de l'aide." L'Economiste du tiers monde, No. 3 (Avril - Mai 1974), pp. 26-28 Merip Reports. No. 29 (June 1974), pp. 17-20
6. Feroz Ahmed, "Building Dependency in Pakistan," Merip Reports. No. 29 (June 1974), pp. 17-20
7. Feroz Ahmed, "Industrialization or Underdevelopment?, "Merip Reports, No. 32 (November 1974), pp. 27-30
8. Feroz Ahmed, "The Green Revolution' in Pakistan: Social Change and Economic Independence," Paper presented at the Afro-Asian Conference on "An Appraisal of the Relationship between Agricultural Development and Industrialization," sponsored by United Nations African Institute for Economic Development and

Planning, held at Tananarive (Madagascar), 4-14 July 1975; CS/2592-2

9. Feroz Ahmed, "Foreign Investment in Pakistan," Third World Forum, Vol. 1 No. 1 (August-September 1974), pp. 13-19.
10. Feroz Ahmed, "Aiding Underdevelopment in Pakistan," Merip Reports, No. 42 (November 1975), pp. 19-22
11. Feroz Ahmed "Pakistan: the New Dependence," Paper presented at the First Congress of the Third World Economists, held at Algiers, February 2-7, 1976; also published in Race & Class Vol. XVIII, No. 1 (Summer 1976). pp. 3-22.
12. Palme Dutt, op cit.
13. Jawaharlal Nehru, The Discovery of India, New York: Doubleday, 1960, p. 213
14. V.I. Pavlov, The Indian Capitalist Class: a historical study, New Delhi: People's Publishing House, 1964, pp. 252-55.
15. اے۔آر شبلی، پاکستان کے دیہ خدا، لاہور: پیپلز پبلشرز، ۱۹۷۳ء ص ۲۶۔
16. Y.V. Gankovsky and L.R. Gordon-Polonskaya, A History of Pakistan: 1947-1958, Lahore: People's Publishing House, n.d., pp. 100-101
17. Central Statistical Office (C.S.O), Government of Pakistan, 25 Years of Pakistan in Statistics, pp 384-401
18. Election Manifesto of PPP, op. cit, p.7
19. Pavlov, op. cit., pp 231-32
20. Ibid., p. 242
21. Ibid., pp. 252-53
22. Ibid., p. 260

23. Hanna Papanek, "Pakistan's Big Businessmen: Muslim Separatism, Enterpreneurship, and Partial Modernization," Economic Development and Cultural Change, Vol. 21, No. 1 (October 1972), pp. 8-17

24. C.S.O., op. cit., pp. 422-428-31

25. W. Norman Brown, The United States and India, Pakistan and Bangladesh, Cambridge: Harvard University Press, 1972, p 399

26. Bilal Hashmi, "The Beginnings of U.S - Pakistan Alliance," Pakistan Forum, Vol. III, Nos. 6&7 (March-April 1973), pp 3-10

27. Gankovsky and Gordon - Polonskaya, op. cit., p. 166

28. Liaquat Ali Khan, Pakistan: The Heart of Asia: Speeches in the United States and Canada, May and June 1950 by the Prime Minister of Pakistan, Cambridge: Harvard University Press, 1950, p. 86

29. Gankovsky and Gordon-Polonskaya. op. cit., p. 225

30. C.S.O., op. cit., p. 306

31. Ibid.

32. Eugene Black, quoted by Bruce Nissen, "The World Bank: A Political Institution," Pacific Research and World Empire Telegram (September-October 1971).

33. C.S.O., op. cit., p. 306

34. Ibid.

35. Ibid

36. Pakistan Economic Survey 1970-71, Islamabad: Ministry of Finance Government of Pakistan.

37. Toronto Globe and Mail, 10 April 1971

38. New York Times, 2 May 1971; Washington Post, 10 July 1971.

39. New York Times, 4 August 1971..
40. Dawn, 9 January 1972.
41. Ibid.
42. Ibid., 20 January 1972.
43. Ibid., 30 January 1972.
44. Monring News, 15 May 1972.
45. Pakistan Economic Survey 1972-73, Islamabad : Finance Division, Government of Pakistan, pp. 107-108
46. Pakistan Economic Survey 1973-74, p. 136
47. Pakistan Economic Survey 1975-76 pp. 147-48
48. Dawn, 12 March 1976.
49. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 148
50. Dawn, 4 April 1975.
51. Lester Pearson, Partners in Development, New York: Praeger 1969.
52. John D. Montgomery, Foreign Aid in International Politics, Englewood-Cliff: Prentice-Hall. 1967, pp. 46-49.
53. David Wightman "The Export Stake of Industrial Countries in the Third World," in U.N. Centre for Economic and Social Information (Ed.), The Case for Development, New York; Praeger, 1973 p. 208.
54. Albert Waterston Planning in Pakistan, Baltimore: The Johns Hopkins Press, 1963, p. 35
55. Adam Curle, Planning for Education in Pakistan, Cambridge: Harvard University Press, 1966, p. xviii.
56. Waterston op. cit., p. 36
57. Ibid., p. 38
58 . Ibid., p. 35
59. Stephen R. Lewis, Pakistan: Industrialization and Trade Policies,

London: Oxford University Press, 1970, p. 5

60. Waterston, op. cit., p. 39
61. Ibid., p. 98
62. Wouter Tims, Monthly Newsletter (DAS), March-April 1965, p. 6
63. Mahbub ul Haq, The Strategy of Economic Planning, Karachi: Oxford University Press, 1963, pp. 49-55
64. Lewis, op. cit., p. 35
65. Eighth Annual Report on the Operations of the Development Advisory Service, July 1, 1969-June 30, 1970, Centre for International Affairs, Harvard University, p. 16
66. Policies and Operations: The World Bank, IDA and IFC, June 1971, p. 53.
67. J. Mader, Who's Who in the CIA, Berlin
68. Zulfikar Ali Bhutto, Let the People Judge, Pakistan People's Party Political Series (2), Lahore, 1969, p. 40
69. Mahbub ul Haq. op. cit.
70. Pakistan Industrial Credit and Investment Corporation Ltd. (PICIC), 18th Annual Report, for the year ended December 31, 1975, p. 10
71. Gustav Papanek, Pakistan's Development: Social Goals and Private Incentives, Cambridge: Harvard University Press, 1967, p. 90
72. Industrial Development Bank of Pakistan, Annual Report 1973-74, p. 10
73. Agency for International Development (AID), Country Assistance Program FY 1967: Pakistan, Washington D.C: Department of State, 1965, pp. II/B. 3-22 & 27
74. Ibid., p. 3-28

75. New York Times, 18 January 1965.

76. Max M. Millikan and Walt W. Rostow, "Criteria of Eligibility for Assistance," in Gaustav Ranis (Ed.), The United States and the Developing Economies, New York: Norton, 1964, p. 93

77. Edward S. Mason, Economic Development in India and Pakistan, Centre for International Affairs, Harvard University, no. 13, September 1966.

78. Pakistan Economic Survey 1970-71, p. 32

79. Irving Brecher and S.A. Abbas, Foreign Aid in Pakistan, London: Cambridge University Press, 1972, p. 23

80. Mohammad Tariq Wasem, "Pakistan's Economic Development 1958-1969," Forum (Dacca), 25 April 1970, p. 6

81. Pakistan Economic Survey 1975-76, p.9

82. Ibid.

83. Gordon C. Winston and A. MacEwan, "A Note on the Use-Classification of Four Digit Industries," Pakistan Development Review, Winter 1966.

84. Lewis, op. cit, pp. 79-92

85. Nurul Islam, "Pakistan's Efficient Industrialists?." Forum, 27 December 1969, pp. 8-9.

86. Abdur Rab, Income Taxation in Pakistan, Ph.D Thesis, Harvard University, 1968.

87. Lewis, op. cit., p. 44

88. Brecher and Abbas. op. cit.

89. Marine Fisheries Department, Karachi, mimeographed tables, 1963.

90. Lewis, op. cit., p. 65.

91. Farm Mechanization in West Pakistan : Report of the Farm Mechanization Committee, Ministry of Agriculture and Works Government of Pakistan, March 1970.

92. New York Times, 1 November 1970.

93. Pakistan Economic Survey 1975-76. p. 24

94. Ibid., p. 27

95. Rashid Amjad, "A Critique of the Green Revolution in West Pakistan," Pakistan Economic and Social Review, June 1972. p. 27

96. Farm Mechanization in West Pakistan, op. cit., p. 216

97. Pakistan Economic Survey 1974-75. p. 22

98. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 26

99. Farm Mechanization in West Pakistan, op. cit., p. 64

100. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 24

101. Pakistan Economic Survey 1973-74, pp. 23-28

102. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 24

103. Pakistan Economic Survey 1973-76. p. 24

104. Brecher and Abbas, op. cit.

105. Ibid.

106. Foreign Assistance Act of 1969: Hearings before the committee on Foreign Affairs, House of Representatives, 91st Congress, First Session, Washington: Government Publications Office, 1969.

107. Teresa Hayter, Aid as Imperialism, Penguin, 1971, pp. 31 and 49.

108. Dawn, 21 February 1976.

109. Williams S. Krason, Commercial Attache to U.S. Embassy in Pakistan, quoted in On the Hot Line, Embassy of Pakistan in Washington, P.18

110. Feroz Ahmed (August-September 1974), op. cit.

111. Foreign Liabilities and Assets and Foreign Investments of Pakistan (1968-70), State Bank of Pakistan, p.3
112. Ibid., p. 53
113. Ibid., pp. 56-61
114. Ibid., p. 52
115. Lewis, op. cit., p. 55
116. Shahid Amjad Chaudhry, "Private Foreign Investment in Pakistan," Pakistan Development Review, Spring 1970. pp. 100-101
117. Ibid., p. 106
118. Ghulam M. Radhu, The Role of Private Investment in the Economic Development in Pakistan, Ph.D Thesis, University of Pennsylvania Department of Economics, 1972, p. 89
119. Economic Survey of Asia & Far East 1970, New York : United Nations, 1971, p. 43.
120. Radhu, op. cit., p. 101
121. Ibid.
122. Economic Survey of Asia..., op. cit.
123. Chaudhry. op. cit., p. 107; Dawn, 1 July 1972.
124. Radhu, op. cit., p. 25
125. Pakistan Times, 23 September 1970.
126. Punjab Punch, 22 July 1973.
127. Shell International Petroleum Company Ltd., "Aide Memoire on Pakistan," (17 Novemebr 1966), quoted in James W.C. Tomlinson, The Joint Venture Process in International Business: India and Pakistan, Cambridge : M.I.T. Press, 1970, p. 99
128. Brecher and Abbas, op. cit., pp. 230-31

129. Lewis, op. cit., p. 182

130. Radhu, op. cit., p. 108

131. Wightman, op. cit., pp. 157-248

132. Pierre Jalee, The Pillage of the Third World, New York: Monthly Review Press, 1969, pp. 28-55

133. Statement by Under Secretary Casey, Department of State Bulletin, 17 December 1973, p. 736

134. C.S.O., op. cit., p . 306

135. Jagdish N. Bhagwati Amount and Sharing of Aid, Washington:Overseas Development Council, 1970, p. 17

136. Pakistan Yearbook 1971, Karachi: National Publishing House Ltd. 1971, p. 390

137. C.S.O., op. cit., p. 306

138. Brecher and Abbas, op. cit., p. 122

139. New York Times, 18 September 1963, quoted in Montgomery, op. cit., p. 20

140. Lester Brown, Seeds of Change, New York: Praeger, 1970, p. 58.

141. C.S.O., op. cit., pp. 410-11

142. Farm Mechanization in West Pakistan, op. cit. p. 262

143. Pakistan Statistical Yearbook 1974, Ministry of Finance, Government of Pakistan, pp. 256-57

144. Farm Mechanization in West Pakistan, op. cit. pp. 122-24.

145. F. Kanhert et al., Agriculture and Related Industries in Pakistan, Development Centre of the Organization for Economic Co-operation and Development, Paris, 1970, p. 254

146. اسکندر مرزا کی کہانی، خود انکی زبانی، معیار، ۱۵۔۲۲، مئی ۱۹۷۶ء۔

147. U.S Foreign Policy 1972: A Report of the Secretary of State,

Washington : Department of State, April 1973, p. 257

148. Maj. Gen. John O. Moench, "Military Security Assistance," Ordinance, July-August 1973, p. 41
149. Review of the Mutual Security Program Development and Implementation: Hearings of the Committee on Foreign Affairs, Sub-committee for Review of the Mutual Security Programs, House of Representatives, January 22, 1959
150. Mutual Defence Assistance Agreement between the United States and Pakistan, signed in Karachi on 19 May 1954
151. Brecher and Abbas, op. cit., p. 150
152. Foreign Assistance Act of 1969, op. cit., p. 238
153. On the Hot Line, op. cit., p. 17
154. Lewis, op. cit., p. 75
155. I.M.F. Survey, 6 November 1972, p. 104
156. Mohammad Ayub Khan, Friends, Not Masters: A Political Autobiography, New York: Oxford University Press; 1967, p. 184.
157. C.S.O, op. cit., p. 383
158. Brecher and Abbas, op. cit., p. 150
159. C.S.O, op. cit., p. 469
160. Ibid, op. cit., pp. 412-13
161. Brecher and Abbas , op. cit., pp. 246-47
162. C.S.O., , op. cit., p. 425
163. Brecher and Abbas, op. cit., pp. 246-47
164. C.S.O, op. cit., p. 425
165. Harry Magdoff, The Age of Imperialism, New York: Monthly Review Press, 1969, p. 130
166. Jalee, op. cit.

167. Pakistan Statistical Yearbook 1974, p. 264

168. Mhabub ul Haq, "Tied Credits _ A Quantitative Analysis," in J.H Adler (Ed.), Capital Movemnets and Economic Development:New York: St. Martin's Press 1970, pp. 326-59

169. Ibid., p. 358

170. Production Yearbook 1971, Rome: Food and Agricultural Organization 1972, p. 542

171. Feroz Ahmed (November 1975), op. cit

172. John Pincus, Economic Aid and International Cost Sharing, Baltimore: The Johns Hopkins Press, 1965 pp. 127 and 144-45

173. Alavi and Khusro, op. cit., p. 69

174. Mahbub ul Haq (1970), op. cit., p. 330

175. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 12

176. C.S.O. op. cit., pp. 512-23

177. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 12

178. Pakistan Statistical Yearbook 1974, p. 241

179. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 139

180. Ibid., pp. II/86/89

181. Ibid., p. 139

182. Bureau of Emigration, mimeographed tables.

183. نوائے وقت، یکم ستمبر ۱۹۷۶ء۔

184. Dawn, 23 September 1976

185. Pakistan Economic Survey 1974-75, pp. 121

186. Pakistan Economic Survey 1975-76, p. 152.

187. Ibid., II/120-21

188. Ibid., p. 15

189. Business Recorder, 23 December 1974.

190. Dawn, 29 February, 1976

191. Trade and Industry, September 1975, p. 60

192. Dawn, 2 December 1975.

193. Foreign Trade Statistics of Pakistan: Exports and Re-exports, Government of Pakistan, April-June 1972, April June 1973, and April-June 1974.

194. Survey of Availability of Pakistani Manpower for Foreign Employment (Client Private). Prepared for the Bureau of Emigration. Investment Advisory Centre of Pakistan, September 1974, p. 159

195. Bureau of Emigration, mimeographed tables.

196. Ibid.

197. Feroz Ahmed (Summer 1976), op.cit.

198. "Text of Pakistan, Iran Protocol," Dawn, 14 February 1975.

199. Dawn, 13 August 1975.

200. الفتح، ۱۴۔۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء۔

ڈاکٹر فیروز احمد کی یہ کتاب ''سامراج اور پاکستان''، تاریخ اور ان کے اثرات کو سمجھنے میں مدد دیگی۔ خاص طور سے پاکستانی عوام کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ وہ برطانوی اور امریکی سامراج کی گرفت میں رہے اور ذہنی طور پر اس قدر مفلوج ہو گئے ہیں کہ کسی بھی سیاسی تسلط کو قبول کرنے پر تیار ہیں۔ یہ کتاب عالمانہ طرز پر گہری سوچ اور فکر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اردو میں اس نوعیت کی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اس کا مطالعہ سامراج اور اس کے تبدیل ہوتے ہوئے نظریات کو سمجھنے میں مدد دیگا۔

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
on facebook.com/fictionhousepublishers
ISBN 978-969-562-521-7